مفکرِ اسلام ، قائد اسلامی انقلاب مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

ایک
درویش سیاست دان

مرتّب :

سیّد انور قدوائی

جمعیۃ پبلیکیشنز

متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون : ۰۴۲-۵۴۲۷۹۰۱-۲
E-Mail: juipak@wol.net.pk

ضابطہ

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : درویش سیاست دان
ناشر : محمد ریاض درانی
اشاعت اول : ستمبر ۲۰۰۳ء
کمپوزنگ : جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر، وحدت روڈ لاہور
سرورق : جمیل حسین
مطبع : اشتیاق اے مشتاق پریس، لاہور
قیمت : 120/- روپے

بتعاون:

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان، کراچی

انتساب

بڑے باپ کے بڑے بیٹے
مولانا فضل الرحمٰن

کے

نام

فہرست

۱-	عرض ناشر	ریاض درانی	۷
۲-	پیش لفظ	مولانا زاہد الراشدی	۹
۳-	مقدمہ	مولانا فضل الرحمٰن	۱۳
۴-	اعتراف حقیقت	اکرم خان درانی	۲۳
۵-	گزارش	انور قدوائی	۲۹
۶-	حرفِ اول	انور قدوائی	۳۳
۷-	آخری ملاقات		۳۷
۸-	۱۴ اکتوبر		۴۱
۹-	مولانا مفتی محمود کا اعزاز		۴۵
۱۰-	درویش وزیر اعلیٰ		۴۹
۱۱-	پاکستان قومی اتحاد		۵۳
۱۲-	دھوکا ہو گیا		۶۵
۱۳-	جناب بھٹو، مولانا مفتی محمود آمنے سامنے		۶۹
۱۴-	ایک تاریخی خط		۷۳
۱۵-	ایک تقریر — ایک لائحہ عمل		۸۵
۱۶-	مولانا مفتی محمود...... درویش سیاست دان		۱۰۱
۱۷-	ایک غیر معمولی خط — ایک تاریخی دستاویز	مصطفیٰ صادق	۱۰۵
۱۸-	مذاکرات کے لیے مناسب ماحول تیار کرنے کی خاطر تجاویز		۱۱۵

۱۹- آخری دعوت...... آخری ملاقات ۱۱۹
۲۰- مولانا مفتی محمود کا مشن ۱۲۱
۲۱- انتقال کی خبر ۱۲۵
۲۲- مفتی محمود کی علمی اور تدریسی زندگی ۱۲۹
۲۳- مفتی صاحب ایک عظیم رہنما تھے میاں طفیل محمد ۱۳۹
۲۴- وزیر اعلیٰ چٹائی پر بیٹھ کر احکام جاری کرتا رہا نوابزادہ نصر اللہ خاں ۱۴۱
۲۵- مفتی صاحب کی وفات کی خبر نے مجھ پر وہی اثر کیا جو سقوطِ مشرقی پاکستان کی خبر نے کیا تھا سردار عبدالقیوم خان ۱۴۹
۲۶- مفتی صاحب قوم کی کشتی کے ناخدا تھے مولانا عبیداللہ انورؒ ۱۵۹
۲۷- اسلام کا تصور قیادت اور مفتی محمود محمد صلاح الدین ۱۶۳

مولانا مفتی محمود کے انتقال پر ملک کے اہم اخبارات کے اداریے

۲۸- روزنامہ نوائے وقت ۱۷۷
۲۹- روزنامہ جنگ ۱۸۱
۳۰- روزنامہ جسارت، کراچی ۱۸۳
۳۱- روزنامہ وفاق ۱۸۵
۳۲- روزنامہ پاکستان ٹائمز ۱۸۸
۳۳- روزنامہ امروز، لاہور ۱۸۹
۳۴- روزنامہ حریت، کراچی ۱۹۰
۳۵- روزنامہ دی مسلم، اسلام آباد ۱۹۱
۳۶- ہفت روزہ ایشیا، لاہور ۱۹۳
۳۷- سفر آخرت کی جھلکیاں ۱۹۵
۳۸- حضورؐ مجھے بلا رہے ہیں ۱۹۹

عرض ناشر

مفکر اسلام مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ علماء کرام، اہل علم اور شاگردوں کی عقیدت و محبت یا والہانہ لگاؤ ہونا ایک فطری امر ہے کیونکہ یہ رشتہ محبت ہے ہی اتنا مضبوط۔ اور تاریخ اسلام میں ابتدا ہی سے اس طرح مشاہدہ ہوتا چلا آ رہا ہے کہ شاگرد اساتذہ کرام پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن کسی صاحب علم کا ایسے شعبہ میں جس سے بظاہر اس کا تعلق نظر نہ آتا ہو اپنوں اور پرایوں کا اس حد تک متاثر ہونا کہ ان کا تعلق محبت و عقیدت میں تبدیل ہو جائے اس کے بلند ترین کردار اور اس شعبہ میں مہارت کی اعلیٰ ترین دلیل ہے۔ مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ان نابغہ روزگار شخصیات میں سرفہرست ہے۔ جنہوں نے علمی میدان میں تو کروڑوں عقیدت مند پیدا کیے ہی لیکن سیاست کے خاردار میدان میں مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح لاکھوں افراد کو عقیدت مند بنایا اور لوگ آپ کی مہارت کے معترف ہوئے وہ آپ کی سیاسی بصیرت اور بلندیٔ کردار کا برملا اعتراف ہیں۔

جب سے مفتی محمود اور جمعیۃ علماء اسلام کے اکابر کے علمی کارناموں کو منصۂ شہود پر لانے کے جذبے کا آغاز ہوا یہ خواہش دل میں بڑی شدت سے مچلتی رہی کہ کاش کوئی مفتی محمودؒ کی سیاسی بصیرت اور ملی و سیاسی خدمات پر بھی قلم اٹھائے لیکن اپنے حلقہ میں اس کام کو کام ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اور جو لوگ اس کام کی صلاحیت رکھتے تھے وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد عبداللہ، مولانا زاہد الراشدی، محمد فاروق قریشی کی توجہ بارہا اس طرف دلائی لیکن علمی اور سیاسی مصروفیات کا عذر معقول تراش کر میری معروضات سے یہ حضرات کنی کترا جاتے تھے۔ اللہ بھلا کرے محترم بزرگ اور حضرت مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے مخلص عقیدت مند محترم سید انور قدوائی صاحب کا کہ انہوں نے میری درخواست قبول فرماتے ہوئے ''حضرت مفتی محمود'' کی سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اور بعض تاریخی واقعات کے ذیل

میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا اور ان واقعات کے ذیل میں مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی بصیرت اور بلندی کردار کو اجاگر کیا۔ اگرچہ اپنی گوناگوں مصروفیت کی وجہ سے انہوں نے پوری سیاسی زندگی کا احاطہ کرنے سے معذرت ظاہر کرتے ہوئے مفتی محمودؒ سے متعلق اس کتاب کو اپنی ''یادوں'' تک محدود رکھتے ہوئے اس کو اپنی عقیدت کا اظہار قرار دیا مگر میں سمجھتا ہوں کہ قارئین کے لیے ''مفتی محمودؒ'' کی سیاسی زندگی کو سمجھنے اور ان کی بلندی کردار کے اعتراف کے لیے یہ ایک بہترین کاوش ہے۔

محترم انور قدوائی صاحب جمعیۃ علماء اسلام کے تمام کارکنوں اور ہم سب کی طرف سے خراج تحسین کے مستحق ہیں اور میرے لیے تو وہ عظیم محسن ہیں کہ ان کی کاوشوں کی وجہ سے میں مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی روح مبارک کو مسرت سے لبریز دیکھ رہا ہوں کہ انہوں نے ابھی تک مفتی صاحب کو بھلایا نہیں ہے اور ہم مفتی محمودؒ کو بھلا بھی کیسے سکتے ہیں۔ کیونکہ اپنے اسلاف کو بھولنے والی قومیں زندہ نہیں رہا کرتیں ہم تو پھر بھی قدامت پسند ہیں۔ مفتی محمود جمعیت علماء اسلام کی زندگی و تابندگی، مشن و مقصد، کردار و گفتار سب کچھ ہی ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن اس لیے قابل مبارک باد نہیں کہ وہ مفتی محمودؒ کے فرزند ہیں بلکہ اس لیے قابل مبارک باد، قابل عقیدت ہیں کہ انہوں نے مفتی محمود کے مشن کو زندہ رکھا۔ اپنے کردار سے مفتی محمود کے کردار کی لاج رکھی۔ آج مفتی محمود کے عقیدت مندوں کا محور مولانا فضل الرحمٰن اسی سیاسی بلندی کردار کی وجہ سے ہی ہیں جس کی وجہ سے وہ مفتی محمود سے متاثر تھے۔ مفتی محمود کا یہ مشن انشاء اللہ تا قیامت زندہ اور تابندہ رہے گا انشاء اللہ۔ میں دوبارہ برادر محترم جناب انور قدوائی سے اظہار تشکر کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور ہمیں مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کو اسلام کا گہوارہ بنائے۔ آمین

محمد ریاض درانی

مسجد پائلٹ ہائی سکول وحدت روڈ، لاہور

042 5427901-2

پیش لفظ

نحمده تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علی رسوله
الکریم وعلی آله واصحابه واتباعه اجمعین

یہ اس دور کی بات ہے جب ایوبی آمریت کے خلاف تحریک زوروں پر تھی اور حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ ایک احتجاجی مظاہرہ میں پولیس کے تشدد سے زخمی ہو کر میو ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ جمعیۃ علماء اسلام کے آرگن ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کی ادارت میں مولانا عزیز الرحمٰن خورشید اور مرکزی دفتر میں ان کی رضا کارانہ معاونت کے لیے ان کے چھوٹے بھائی مولانا سعید الرحمٰن علوی مرحوم اور راقم الحروف اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ترجمان اسلام کے علاوہ قومی اخبارات میں جماعتی خبروں اور بیانات کی اشاعت بھی ہماری دلچسپی کے امور میں شامل تھی۔

اس دوران جن اخبار نویس حضرات سے تعارف ہوا ان میں جناب سید انور قدوائی سرفہرست ہیں۔ وہ نوائے وقت میں رپورٹر تھے۔ ان کے علاوہ جنگ کراچی کے نمائندہ سید فاروق احمد روز نامہ امروز لاہور کے چودھری خادم حسین اور جناب سجاد کرمانی کے ساتھ بھی اکثر رابطہ رہتا تھا اور اول الذکر تینوں حضرات کے ساتھ تو یہ رابطہ وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر مستحکم ہوتا چلا گیا کہ اس نے بے تکلف دوستی کی شکل اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ جب میں نے ۱۹۷۵ء میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کا منصب سنبھالا تو ان حضرات کی

شفقت و مہربانی کے باعث مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ تینوں دوست اخبارات کے نمائندے نہیں بلکہ خود میرے ساتھی اور شریک کار ہیں۔ ہم خبروں بلکہ بسا اوقات جماعتی پالیسیوں کے حوالہ سے بھی ایک دوسرے سے مشورہ کرلیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو ''مطلب'' کی بات بتادیا کرتے تھے۔

قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ بھی ان حضرات کا تعلق ایک سیاسی لیڈر اور اخبار نویس کا نہیں بلکہ دوستوں جیسا تھا۔ جماعتی ذمہ داری کے حوالے سے میں چونکہ درمیان کی کڑی تھا اس لیے اکثر اوقات ملاقاتوں کا اہتمام اور مشکل بلکہ مشکل ترین مواقع پر بھی ملاقات کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنا میری ذمہ داری ہوتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ان میں سے کسی دوست نے مفتی صاحب سے ملاقات کرنا چاہی ہو اور مفتی صاحب نے انتہائی مصروفیت کے باوجود کبھی صاف انکار کیا ہو۔ مفتی صاحب کی دیگر مصروفیات کو آگے پیچھے کرنے میں مجھے ضرور دقت پیش آتی تھی لیکن عام طور پر اس ''دوستانے'' کو نبھانے میں مجھے کامیابی حاصل ہوجایا کرتی تھی۔

حضرت مولانا مفتی محمود کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام اور ملک پر جو حالات پیش آئے اس کے نقصانات میں ایک بات یہ بھی محسوس کی جارہی ہے کہ مفتی صاحب پر علمی، فکری اور سیاسی محاذ پر جو کام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا بالخصوص اسلامی نظام کے حوالہ سے مفتی صاحب کی اجتہادی فکر کو اجاگر کرنے اور علماء کی نئی نسل تک ان کا پیغام پہنچانے کا کام تو سرے سے ہو ہی نہیں سکا جبکہ میری طالب علمانہ رائے میں ''علماء وفکری سیاست'' کے محاذ پر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کی علمی و فکری کاوشوں کو اگر مرتب اور مدون شکل میں پیش کیا جاسکے اور اس پر خالصۃً علمی و فکری بنیادوں پر تحقیقی و تجزیاتی محنت ہوجائے تو آج کے نوجوان علماء کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ خود میرا اس طرف کبھی کبھی ذہن جاتا ہے لیکن تدریسی مصروفیات اور دیگر متعلقہ

مشاغل کے حصار کے باعث سوچ و بچار ہی کے دائرے میں پھڑ پھڑا کر رہ جاتا ہوں۔

برادرم حافظ محمد ریاض درانی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں کہ وہ علماء حق کی تاریخ، جمعیۃ علماء اسلام کی جدوجہد اور اکابر جمعیۃ بالخصوص حضرت مولانا مفتی محمود کی تعلیمات و افکار کی اشاعت و ترویج کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں اور انہیں جمعیۃ علماء اسلام کے سیکرٹری اطلاعات کے طور پر کام کرتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ یہ منصب اپنے تقاضوں کے مطابق ایک واضح فکر اور سوچ رکھنے والے کارکن کے پاس ہے جو نہ صرف خود اپنے کام میں ہمہ تن مصروف ہے بلکہ دیگر متعلقہ حضرات کو جھنجھوڑنے اور ان سے کام لینے کے ذوق سے بھی بہرہ ور ہے۔ یہ حافظ محمد ریاض درانی کے حسن ذوق کی علامت ہے کہ انہوں نے جناب سید انور قدوائی کو حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے پر آمادہ کیا اور محترم سید انور قدوائی کی وضعداری ہے کہ انہوں نے مفتی صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات و مشاہدات کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ایک معتد بہ مواد بھی ان کی سیاسی جدوجہد کے حوالہ سے مرتب کر دیا ہے جس سے پاکستان کی قومی سیاست میں حضرت مولانا مفتی محمود کے سیاسی مقام اور قد کاٹھ کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے ان کے دور سیاست کے مجموعی ماحول اور سیاسی تناظر کا نقشہ بھی قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔

سید انور قدوائی صاحب نے جو تاثرات قلمبند کیے ہیں اور جو مواد مرتب کر کے پیش کیا ہے وہ حضرت مولانا مفتی محمود کے ساتھ عقیدت کا اظہار بھی ہے۔ مفتی صاحب کی درویشانہ سیاست، اصولی جدوجہد اور بے لوث قیادت کا اعتراف بھی ہے اور اگر اسے مفتی صاحب کی وفات کے بعد قومی سیاست میں رونما ہونے سیاسی اور فکری خلاء کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ سیاسی قدروں کے مسلسل زوال کا بالواسطہ مرثیہ بھی ہے جس کا تاثر و احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے قومی سیاست میں اخلاقی قدروں کا جو حشر ہوا ہے اور اصول،

اخلاق کے خانوں پر جن نئی روایات و اقدار نے قبضہ جمالیا ہے انہیں دیکھ کر ان چند گنے چنے افراد کے حوصلے کی داد دینا پڑتی ہے جو آج بھی قومی سیاست میں اصول، ضابطہ، دستور، قانون اور اخلاقیات کا نام لیتے ہیں اور پھر یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی آواز قومی سیاست کے نقار خانے میں سنی جائے اور اسے پذیرائی حاصل ہو۔ ایسے میں حضرت مولانا مفتی محمود کی یاد بہت آتی ہے اور بسا اوقات انہیں یاد کر کے پریشان ہوتا رہتا ہوں۔ اس پریشانی میں سید انور قدوائی نے پرانے تذکرے چھیڑ کر اور اضافہ کر دیا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے سیاسی مربی و قائد حضرت مولانا مفتی محمود کا خوبصورت انداز میں تذکرہ کیا ہے اور اس میں برادرانہ محبت کے ساتھ میرا ذکر بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازیں اور ہم سب کو پاکستان کی قومی سیاست میں مولانا مفتی محمود کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھنے کے لیے اپنے اپنے دائرہ میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین

ابوعمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ
۴ اپریل ۲۰۰۳ء

مقدمہ

الحمد لله وحده' والصلوٰة والسلام على من لا نبي بعده وعلى اله واصحابه اجمعين اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم- بسم الله الرحمن الرحيم

''ثم اورثنا الكتاب الذين اصطفينا من عبادنا''

نبی آخر الزمان رحمت کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی وراثت کا بار گراں اٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ ہر دور میں ایسی برگزیدہ شخصیات کا انتخاب فرماتا رہا جن کو اس دور کے اعتبار سے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی سی صفات کا کچھ نہ کچھ حصہ عطا فرماتا رہا تاکہ وہ اس امانت سے بہتر طور پر سبکدوش ہونے میں کامیاب ہوسکیں۔ ان برگزیدہ شخصیات کا بھی درجات میں ایک کو دوسرے پر فضیلت اور برتری کا معیار اللہ تعالیٰ نے قائم رکھا۔ کسی کو کچھ خصوصیات اور کسی کو کچھ۔ کوئی تحریر کے میدان کا پیشوا تو کوئی خطابت میں سحر انگیزی کا حامل اور کسی کو ایسی جامعیت سے نوازا کہ جس میدان میں اترے کامیابی و کامرانی اس کے لیے فرش راہ کے طور پر تیار' غرض ''ذالک فضل الله يؤتيه من يشاء'' کا مصداق ہر دور میں کوئی نہ کوئی شخصیت کا موجود رہنا سنت خداوندی بھی ہے اور دین کی نشاۃ ثانیہ یا احیائے سنت کے لیے ضروری بھی۔

گزشتہ صدی پر ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو حضرت مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی ہمہ گیر جامع

شخصیت اس فہرست میں ''مہ کامل'' کی طرح دمکتی چمکتی ہر میدان میں فتح و کامرانی کا جھنڈا اٹھائے سب سے الگ اور ممتاز نظر آتی ہے اور فضل خداوندی کا عجیب مظہر یہ ہے کہ جس وقت آپ بیت اللہ کی زیارت کے بجائے خالق حقیقی کی زیارت پر رخصت ہوتے ہیں تو آپ کی فتوحات و کامرانی کا سورج نصف النہار پر ہوتا ہے اور صرف پاکستان میں نہیں دنیا بھر کے کروڑوں مسلمانوں کی آنکھیں آپ کی رحلت پر اشک بار ہوتی ہیں اور دشمن بھی آپ کی کمی کا اعتراف کرتا ہے۔

حضرت والد صاحب کی شخصیت کی جامعیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آپ کی شخصیت کے کسی بھی پہلو کے بارے میں کوئی مؤلف یا سوانح نگار صحیح انصاف اور آپ کے کارناموں کا احاطہ کر سکا ہے۔ ہر کتاب کی اشاعت آپ کی شخصیت کے بارے میں قارئین کو تشنہ لب ہی رکھتی ہے۔ بارہا اس سلسلے میں آپ کے عقیدت مند قلمکاروں اور کالم نگاروں سے گفتگو ہوئی اور انہوں نے برملا اس کا اعتراف کیا کہ اپنی تمام تر عقیدت اور قلم کی جولانیوں کے باوجود ہم اپنے اندر یہ ہمت نہیں پاتے کہ اس موضوع کا حق ادا کر سکیں گے۔ اس لیے ناکافی لکھنے سے بہتر ہے کہ قلم کی جولانیوں کو آزمایا ہی نہ جائے۔ ہمارے پرانے رفیق محمد فاروق قریشی گزشتہ ۱۸ سال سے ۱۶ اکتوبر کو روزنامہ جنگ کے مفتی محمود ایڈیشن میں تسلسل سے لکھ رہے ہیں لیکن اب تک وہ ''مفتی محمود'' کی شخصیت اور آپ کے کارناموں کا احاطہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

قلم کاروں کے اس عجز کے باوجود میری اور مفتی محمود کے مداحوں کی شدید ترین خواہش اور اصرار رہا کہ حضرت مفتی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے کام کیا جائے۔ اس سلسلے میں کراچی کے احباب نے محترم مفتی نظام الدین شامزئی، جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور جناب محمد فاروق قریشی کی نگرانی میں مفتی محمود اکیڈمی بھی قائم کی اور ہمارے عزیز حافظ ریاض درانی سیکرٹری اطلاعات جمعیت علماء اسلام پاکستان نے بھی مداحوں کے اس

اصرار کے بعد ''جمعیت پبلی کیشنز'' کے تحت حضرت مفتی محمود صاحب کے علمی کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لیے کوششوں کا آغاز کیا اور حضرت مفتی محمود صاحب کے خادم و رفیق مفتی محمد انور شاہ صاحب سے حضرت والد صاحب کے قاسم العلوم ملتان دور کے فتاویٰ حاصل کر کے ''فتاویٰ مفتی محمود'' کے نام سے فقہی خزانے کو منظر عام پر لانے کی سعادت حاصل کی جس کی اللہ تعالیٰ کے فضل سے تین جلدیں اشاعت کے مراحل سے گزر چکی ہیں جبکہ چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلدیں مدوّن ہو کر طباعت کے لیے جانے کے مراحل میں پہنچ چکی ہیں۔ توقع ہے کہ دس سے گیارہ جلدوں میں یہ علمی ذخیرہ ''مفتی محمودؒ'' کے تفقہ کی خداداد صلاحیتوں کا احاطہ کر سکے گا جبکہ حضرت مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے محدثانہ گوشہ کو اجاگر کرنے کے لیے شرح ترمذی (عربی) کمپوزنگ کے مراحل میں ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اس عظیم علمی ذخیرہ سے علماء کرام استفادہ کر کے حضرت مفتی محمود کو خراج عقیدت پیش کریں گے اور ان کی شکایت کے ازالہ کے ساتھ ان کی علمی تشنگی بھی دور ہوگی۔

حضرت مفتی محمودؒ کے ان علمی گوشوں کے منظر عام پر آنے سے اگرچہ علوم نبویہ اور فقہ حنفیہ کے بہت سے ایسے گوشے اور علمی نوادر علماء کرام اور اہل علم تک پہنچے جن تک ابھی بہت سارے علماء کرام کی تحقیقی نگاہیں نہ پہنچ سکیں تھیں۔ مگر میدان سیاست اور امور مملکت اور خصوصی طور پر قصر حکومت کے ایوانوں کے پرخطر ماحول میں ''مفتی محمودؒ'' نے جس طرح مجددانہ کارنامے انجام دیے اور علماء کرام کو اس میدان میں ایک منفرد مقام دلایا اور سیاسی ماحول کو جس طرح پاکیزہ کیا اور اس شجر ممنوعہ کو علماء کرام کے لیے سازگار بنایا اور بحیثیت وزیر اعلیٰ درویشی کی اور بحیثیت قائد حزب اختلاف ایک بلند کردار کی روایت ڈالی۔ اس نے ولی خان جیسے بڑے قوم پرست لیڈر کو یہ کہنے پر مجبور کیا:

> ''مفتی محمود میرے سیاسی امام ہیں۔ ہم ان کے بغیر کسی سیاسی عمل میں شریک نہیں ہوں گے۔ وقت کے آمر مطلق اور اپنے وقت کے جینیس

ترین فرد (بھٹو) کو اس طرح اعتراف شکست کا اعلان کرنے پر مجبور کیا۔ "میں کانوں پر ہاتھ لگا کر توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ مفتی محمود کے خلاف الیکشن میں حصہ نہیں لوں گا۔"

جنرل ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی نظام کے قیام کے وعدہ کی وجہ سے بھرپور تعاون کیا اور آپ اکثر فرماتے تھے کہ ہم نے صرف اور صرف اسلامی نظام کے لیے اپنی پوری سیاسی زندگی داؤ پر لگا دی اور جب آپ پر اس سلسلے میں بہت زیادہ اعتراضات ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ ہم نے اسلامی نظام کے سچے موتی کے حصول کے لیے سمندر میں غوطہ لگایا ہے۔ جب ہم کامیاب ہوں گے تو یہ اعتراض کرنے والے منہ دیکھتے رہ جائیں گے مگر جب جنرل ضیاء الحق نے (مسلم لیگ کے زعماء کی طرح کہ جس طرح انہوں نے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو دھوکہ دیا تھا) دھوکہ دیا اور وعدے پورے نہیں کیے بلکہ اسلامی نظام کے سلسلہ میں فوج کا بہانہ بنا کر وعدوں سے روگردانی کی تو مفتی محمود نے اقتدار کو ٹھوکر مار کر جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف ایسے وقت میں آواز بلند کی جس وقت پی پی پی، مسلم لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی جیسی بڑی جماعتیں زبانوں پر تالے لگائے گوشہ عافیت میں بیٹھی ہوئی وقت کا انتظار کر رہی تھیں اور خاموشی کو اپنے لیے ڈھال بنائے ہوئے تھیں۔ ایسے میں مفتی محمود کی جرأت مندانہ للکار اور آمریت کے خلاف تحریک کے اعلان نے ان بڑی جماعتوں کے مردہ اجسام میں جان ڈالی اور ضیاء الحق کے خلاف عوام میدان میں اترے۔ اس وقت واحد مفتی محمود تھے جنہوں نے خیبر سے کراچی تک اور مہران سے بولان تک بڑے بڑے جلسے کر کے ضیاء الحق کی آمریت کو للکارا اور اس کو وقت کا سب سے بڑا دجال اور کذاب اور قوم پر ظلم مسلط کرنے والا قرار دیا حالانکہ مفتی محمود کے اس مجاہدانہ کردار سے بہت سارے اپنوں نے بھی اتفاق نہیں کیا مگر مفتی محمود کے عزائم ان کی کنارہ کشی بلکہ بعض اہم لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے متزلزل نہ ہو سکے اور آپ خالق حقیقی کی طرف روانگی تک اپنے اس مضبوط موقف پر قائم

رہے اور آپ کی آخری فقہی گفتگو بھی جنرل ضیاء الحق کے ایک غیر شرعی عمل کی روک تھام کے لیے تھی مگر اس کے باوجود جنرل ضیاء الحق مفتی محمود کے سیاسی کردار اور اس میدان میں آپ کی مجددانہ حیثیت کے اعتراف پر مجبور تھا۔

> مفتی محمود نے پاکستان کی تاریخ میں اہم سیاسی کردار ادا کیا۔ خاص طور پر تحریک نظام مصطفیٰ میں انہوں نے ایسی قیادت مہیا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔ ان کے سیاسی کارناموں کے سب ہی معترف تھے۔ سیاسی معاملات میں ان کی سوجھ بوجھ اور بصیرت نے مجھ پر اثر چھوڑا ہے۔

سردار عبدالقیوم جیسے زیرک سیاست دان آپ کی سیاسی بصیرت کا اس انداز میں اعتراف فرماتے ہیں:

> ''میں نے مولانا مفتی محمودؒ کو علمی اور سیاسی دونوں حیثیتوں میں دیکھا۔ ان کی دونوں حیثیتوں پر غور کیا انہیں علمی اور سیاسی ہر دو اعتبار سے غیر معمولی انسان پایا۔''

مولانا محمد تقی عثمانی نائب مدیر دار العلوم کراچی کا سیاسی وابستگی نہ ہونے کے باوجود جو تعلق تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ کس خوبصورت انداز میں مفتی محمود صاحب کی سیاسی بصیرت پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

> مفتی محمودؒ نے اسلامی نظام کے لیے جو قربانیاں دی ہیں وہ ہماری تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔ سیاسی مشغولیات کے ساتھ ساتھ خالص علمی مسائل کے ساتھ حضرت مفتی محمود کی دلچسپی اور علمی تبحر ان کی وہ صفت ہے جو خال خال دیکھنے میں آئی ہے۔

سیاسی میدان میں آپ کی قائدانہ اور مجددانہ صلاحیتوں کا یہ اعتراف پاکستان ہی نہیں

بلکہ عالم اسلام کے حکمرانوں اور دانشوروں نے بھی آپ کی زندگی اور آپ کی وفات کے بعد برملا کیا۔

خادم الحرمین الشریفین جلالۃ الملک شاہ خالد بن عبدالعزیز سے آپ کی ملاقات چند لمحات سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے خوشگوار تاثرات شاہ خالد پر آخر تک رہے۔ وفات پر چند جملوں میں اس کا اظہار اس طرح فرمایا۔

> "شیخ مفتی محمود رحمہ اللہ سے چند لمحات کی صحبت نے مجھے حد درجہ متاثر کیا۔ ان کی علمی اور اسلامی خدمات اہل اسلام کے لیے سرمایہ حیات ہیں۔"

دارالعلوم دیو بند کے مہتمم قاری محمد طیب صاحبؒ نے فرزند دارالعلوم کی حیثیت سے اس انداز میں مفتی محمود کی صلاحیتوں کا لوہا مانا۔

> "مفتی محمودؒ نے ایک زندہ و جاوید تاریخ رقم کر کے بڑا نام پایا۔ وہ ایک جید عالم دین اور مخلص سیاست دان تھے۔"

ممتاز مذہبی اسکالر اور دانشور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے آپ کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا۔

> عالم اسلام میں مفتی محمود کا نام اسلام کے ایک عظیم اسکالر کی صورت میں معروف ہوا۔ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے لیے ان کی خدمات سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔

سابق وزیر دفاع میر علی احمد تالپور آپ کے سیاسی کردار پر ان الفاظ سے روشنی ڈالتے ہیں۔

> مفتی محمود برصغیر کے منجھے ہوئے سیاست دان تھے۔ وہ اپنی سیاسی بصیرت اور خدمات کے سبب بڑے محترم سمجھے جاتے تھے۔

نوابزادہ نصر اللہ خان آپ کے طویل سیاسی سفر کے مستقل رفیق اور سفر و حضر کے ساتھی تھے۔ مفتی محمود رحمہ اللہ کی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے مخفی نہیں تھا۔ ان کا اعتراف مفتی محمودؒ کے بلند کردار اور پاکیزہ زندگی کی سب سے بڑی شہادت ہے اور آپ کی ولایت کی زندہ دلیل ہے۔

مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ نے سرحد میں وزارت علیا پر فائز ہوتے ہی یہ مثال قائم کر دکھائی تھی کہ ایک بوریا نشین عالم ایک جدید جمہوری معاشرہ میں حکومت کے فرائض اپنی تمام تر سادگی اور درویشی کے باوجود بطریق احسن چلا سکتا ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا یہ گوشہ جس کو خادم الحرمین سرمایہء حیات اور دیگر مفکرین جمہوری معاشرہ میں ایک روشن اور نادر مثال قرار دے رہے ہیں اور جس سرمایہ حیات کی قوم کو سخت ضرورت تھی اور جس سے موجودہ جمہوری نظام ایک اچھے راستہ کی طرف گامزن ہو سکتا تھا اور جس سے سیاست دان گندی سیاست کی بجائے پاکیزہ سیاست کی طرف رخ کر سکتے تھے۔ اس گوشہ کو قوم کے دانشوروں اور قلم کاروں اور حضرت مفتی محمود کے عقیدت مندوں اور مداحوں اور خود جمعیت علماء اسلام کے مخلص احباب نے مجھ سمیت منصۂ شہود پر لانے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی اور امتداد زمانہ کی وجہ سے وہ تاریخ کے دبیز پردوں میں چھپتا چلا گیا کہ آج بائیس سال گزرنے کے بعد آئندہ نسل اس نام سے بھی واقف نہیں رہی اور گوشہء سیاست پر اس جیسی مثال کے اثرات تک نظر نہیں آتے اور میں کہتا ہوں کہ ہم سب سے یہ عظیم قومی جرم سرزد ہوا کہ مفتی محمود نے سیاسی میدان میں جو نئی راہ اور بہترین سمت متعارف کرائی تھی ہم نے اس کو اجاگر کرنے کی بجائے اس پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی اور حضرت مفتی صاحب کی عظیم محنت کو ضائع کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد ہی ہماری سیاسی قیادت اس راہ پر چلتی رہتی تو آج قوم کو ان نقصانات کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑتا اور سیاست میں اعلیٰ مثالیں قائم ہوتی رہتیں اور جمہوریت کی پٹڑی صحیح رخ

اختیار کرکے ایک بہترین معاشرہ کی تشکیل اور ایک اچھی منزل تک پہنچ چکی ہوتی۔ مگر تصورات اور حقائق دو الگ الگ عنوانات ہیں۔ ان تمام حالات کے باوجود اب بھی ہمارا سیاسی عمل اور سیاسی قیادت حضرت مفتی محمود کے طرز سیاست سے مستغنی نہیں ہوسکتا اور حضرت مفتی صاحب کا طرز سیاست اختیار کیے بغیر اس سیاست کو صحیح رخ پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ آج سیاست کو پہلے سے زیادہ مفتی محمود کی بصیرت اور مدبرانہ قیادت اور متحمل مزاج قائدین کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر پاکستان کی موجودہ نازک اور خطرناک صورت حال اور عالم اسلام کی زبوں حالی کو دور کرنے اور ملت اسلامیہ کو ایک معزز مقام دلوانے کے لیے مدلل موقف اور بردبار قیادت ہی کام کرسکتی ہے۔ اس ضرورت کا احساس ہر فرد کو ہے۔ اللہ بھلا کرے ہمارے عزیز حافظ ریاض درانی صاحب کا کہ انہوں نے اس ضرورت کا ادراک کیا اور ملک کے مشہور قلم کار اور کالم نگار اور مفتی محمود کے سیاسی کردار کے عینی شاہد جناب سید انور قدائی صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور انہوں نے حافظ ریاض درانی کے اصرار یا موجودہ وقت کی ضرورت کو محسوس کرکے اس کام کی حامی بھری اور مفتی محمود کے سیاسی گوشہ کو منظر عام پر لانے کے لیے پہلی بہترین کوشش کی جو میں سمجھتا ہوں۔ ایک بہت بڑی پیش رفت اور مفتی محمود کے حق کی ادائیگی کی ایک بہترین کاوش ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کوشش حضرت مفتی محمود کی روح کے لیے انبساط کا باعث اور مفتی محمود کے عقیدت مندوں کے لیے مسرت کا سامان لائی ہے۔ میں ان کو اس کاوش پر خراج تحسین پیش کرنا اپنا فریضہ تصور کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی میرے مخدوم کی حیثیت سے میرے لیے بہت ہی قابل قدر ہیں اور اس کاوش کی وجہ سے ان کے علمی اور روحانی قد کاٹھ اور قدر و منزلت میں جو اضافہ ہوا ہے وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اس کا بدلہ رب کائنات ہی اپنے فضل و کرم کے حساب سے عطا فرمائیں گے لیکن المرء مع من احب کی بشارت کا ہم سب کو یقین کامل ہے۔

احب الصالحین ولست منهم لعل الله یرزقنی صلاحاً

حافظ ریاض درانی صاحب بھی میری طرف سے اور جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں اور مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدت مندوں کی طرف سے خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ اس موقع پر میں اپنے قلمکاروں اور کالم نگاروں سے ضرور درخواست کروں گا کہ اس کاوش کو پہلی اور آخری کاوش سمجھ کر اس پر اکتفا نہ کرلیا جائے بلکہ اس پر مزید اضافہ خاص کر جس طرح مولانا زاہد الراشدی صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی محمودؒ کی سیاسی تقاریر اور اسمبلیوں کی تقریریں ہمارے لیے پوری قوم کے لیے بلکہ پوری ملۃ اسلامیہ کے لیے بہت بڑا سرمایہ حیات ہیں۔ ان کی تدوین اور دیگر سیاسی گوشوں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کریں۔ جمعیت علماء اسلام اور جمعیت پبلی کیشنز ہر قسم کے تعاون کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ اللہ تعالیٰ جناب قدوائی صاحب کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور امت مسلمہ کے لیے اس کو نافع بنائے اور مفتی صاحب کے جانشینوں کو مفتی محمود کے مشن پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه محمد و آله و اصحبه اجمعین

(مولانا) فضل الرحمٰن

امیر جمعیۃ علماء اسلام، پاکستان

اعتراف حقیقت

مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا افسانوی اور طلسماتی سحر بچپن ہی سے ذہن وقلب پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ باوجود شدید قربت اور گھر میں آمد و رفت اور خاندان کی عقیدتوں اور محبتوں کے محور ہونے کے آپ سے بے تکلفی کا تصور تک نہیں کیا جا سکا۔ حالانکہ مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ اپنی تمام تر بڑائی، عظمت اور بلند مرتبہ ہونے کے کارکنوں اور ان کی اولاد کے ساتھ نہایت بے تکلفانہ اور محبت آمیز تعلق رکھتے تھے اور آپ کی مجلس ہر قسم کے تکلفات اور پروٹوکول سے پاک ہوا کرتی تھی۔ گھر کے ایک بزرگ کی طرح ایک ایک فرد سے ملاقات اور ان کے احوال پوچھنا اہل علم سے علمی گفتگو۔ عام کارکنوں اور عقیدت مندوں سے بے تکلف اور ظریفانہ مجلس اور نوجوانوں اور بچوں کے ساتھ پر مزاح گفتگو آپ کی طرہ امتیاز تھی لیکن ان تمام تر امور کے باوجود آپ کی شخصیت کا پرشکوہ تصور اور آپ کی عظمت کا سحر کسی طور پر بھی مغلوب یا متاثر نہیں ہوتا تھا۔ کم عمری کی زندگی میں آپ کی بزرگانہ حیثیت ذہن پر چھائی رہی۔ طالب علمی کا دور آپ کی عقیدت و محبت اور آپ کی آمد پر پرجوش نعروں میں گزرا اور جب سن شعور کو پہنچا تو آپ کی زندگی کا ایک ایک پہلو میرے لیے ''آئیڈیل'' کی حیثیت سے ذہن وقلب پر نقش ہوتا رہا۔ زندگی کا کوئی ایسا پہلو میں نے مفتی محمود کی زندگی میں نہیں پایا جس میں جھول تو درکنار عزیمت کے راستہ سے ہٹا ہوا بھی نہیں دیکھا۔ آپ کی زندگی مومن کی نہیں بلکہ مومنِ کامل کی زندگی کا پرتو تھی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عمومی طور پر اور حضرات خلفاء راشدین

خصوصی طور پر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی عملی تصویر تھے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد فرمایا تھا کہ آپ نے خلافت کو جس طرح کانٹوں کی سیج بنایا اللہ تعالیٰ مجھے اس پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ تو کامیاب رخصت ہوئے ہمیں آزمائش کے راستہ پر چھوڑ گئے اور پھر دنیا نے دیکھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اسوہ کامل کی تابعداری کر کے منصب خلافت کو منصب درویشی اور تخت سلطانی کو تخت فقیری سے بدل دیا۔ آپ کے بعد جس حکمران نے اس راستہ کو اپنایا تاریخ عالم میں اس کا نام درخشاں ستارے کے مانند چمکتا ہوا امر ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، سلطان التمش، اورنگ زیب عالمگیر جیسی سینکڑوں شخصیات تاریخ اسلام کا روشن باب ہیں۔

مادیت، پروٹوکول، حفاظتی حصار، بڑے بڑے ایوان صدر وزیر اعظم، سائرن لگی بڑی گاڑیوں اور ہٹو بچو کی صداؤں کے جھرمٹ میں قید حکمرانوں کی خرمستیوں کو دیکھ کر بڑے بڑے نام نہاد دین داروں کو اس راہ میں بھٹکتے دیکھ کر تاریخ اسلام کے ان مندرجہ بالا پاکیزہ کرداروں کے بارے میں شیطان وساوس میں تو ضرور مبتلا کرتا تھا کہ ان واقعات میں صداقت کہاں تک ہے یا یہ واقعات بھی سرکاری شاعروں اور ادیبوں کی چاپلوسی اور ملمع سازی کا کمال ہے۔ اس بات کا تصور تک دل و دماغ کے کسی گوشے میں نہیں آ سکتا تھا کہ اس دور میں بھی ایسی کوئی شخصیت صوبہ کے سب سے بڑے منصب پر بیٹھ کر اور تمام تر اختیارات کی بلا شرکت غیرے مالک ہو کر درویشی اور سلطانی میں فقیری کی ایسی مثال قائم کر سکے گی جس کا مشاہدہ کر کے ہر مسلمان اپنے اسلاف کے بارے میں شیطانی وساوس سے محفوظ ہو سکے گا لیکن مفتی محمود نے اپنی سحر انگیز شخصیت کی طرح اس منصب پر فائز ہو کر زمینی حقائق کا منہ چڑا کر اسلامی عظمت رفتہ کو ہی بحال نہیں کیا بلکہ حضرت عمر فاروق ؓ کے قول کے مطابق جمعیت علماء اسلام اور دین سے وابستگی کا دعویٰ کرنے والی تمام جماعتوں کے عہدیداروں، ذمہ داروں، کارکنوں کو ایک

آزمائش، مشکل اور کٹھن مرحلہ میں ڈال دیا۔

مفتی محمود جب گوشۂ علم سے کوچۂ سیاست کی ''گندگی'' میں ملوث ہوئے تو اپنوں اور مخالفین نے واویلا مچانا شروع کر دیا کہ اب ان کی علمی شخصیت داغدار ہو جائے گی لیکن

رہیں دریا میں اور دامن کو نہ لگے پانی

کے مصداق مفتی محمود نے ہر آزمائش کی گھڑی سے اپنے کو سرخرو کر کے نکالا۔ ایوب خان کی آمریت، ''کالا باغ'' کے ظلم و ستم، سلہری اور گوہر کی کردار کشی اور دور ایوبی کی پرکشش ترغیبات مفتی محمود کو اپنے اصولوں اور موقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا سکیں اور مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی اور پیر محسن الدین، ایوب خان کے اور اس کے سینکڑوں خوشامدیوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر فتح مند ہو کے رہے تا آنکہ مفتی محمود کی قیادت میں جمعیۃ علماء اسلام کی تحریک کے سامنے ایوبی آمریت کا اقتدار سرنگوں ہوا۔

یحییٰ خان جب شراب میں بدمست ہو کر قافلہ محمود پر حملہ آور ہوا تو مفتی محمود اس کے لادینی اقدامات کے سامنے اپنے کارکنوں کے ساتھ صف آرا ہوئے اور آخر کار انتخابات کے بعد مفتی محمود کی جماعت مغربی پاکستان کی دوسری بڑی اور قومی اسمبلی میں تیسری بڑی جماعت کی حیثیت سے ابھری تو اپنے اور بے گانے پھر چیخنے لگے کہ دیکھیں مفتی محمود اب کس طرح دامن بچاتے ہیں مگر مفتی محمود کی شانِ فقیری کو کوئی لالچ یا دھمکی توڑ نہ سکی اور مغربی پاکستان کے سب سے بڑے آمر اور عوام کی نبض پر ہاتھ رکھنے والے ذوالفقار علی بھٹو نے مفتی محمود سے شکست کھانے کے بعد اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان جانے والوں کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ جانے والے اراکین اپنی ذمہ داری پر جائیں۔ ایک طرف کا ٹکٹ لیں۔ مفتی محمود نے اعلان کیا کہ میں جمعیت علماء اسلام کے اراکین کے ساتھ جاؤں گا جس میں ہمت ہے روک کر دکھائے۔ جب مشرقی پاکستان کو توڑ کر اقتدار کے پرستاروں نے یحییٰ خان کی گنگا سے خوب ہاتھ دھوئے اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے تاریخ جمہوریت پر ایک بدنما دھبہ لگایا تو مفتی محمود

پاکستان میں تنہا مجاہد تھے جنہوں نے گلی گلی یحییٰ خان، مجیب الرحمٰن اور بھٹو کو للکار کر پاکستان کا قاتل قرار دے کر مطالبہ کیا کہ پاکستان کے قاتلوں کو عبرت ناک سزا دی جائے۔

بھٹو نے اقتدار کے نشہ میں قومی اسمبلی میں من مانی کی کوشش کی تو ''مفتی محمود'' تنہا قومی اسمبلی میں ذوالفقار علی بھٹو کو للکارتے رہے اور آئین پاکستان کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئے اور جب بھٹو نے مجبور ہو کر سرحد اور بلوچستان میں جمعیت علماء اسلام سے سہ فریقی معاہدہ کیا اور مفتی محمود منصب وزارت اعلیٰ پر فائز ہوئے تو دنیا نے دیکھا کہ خلیفہ اول سیدنا حضرت ابوبکرؓ، خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر درویش حکمرانوں کی یاد تازہ ہو گئی اور موافق و مخالف ہر ایک درویش وزیر اعلیٰ کہنے پر مجبور ہوا۔ شراب کے حکمران صوبہ سرحد آنے سے کترانے لگے۔ ایوان وزیر اعلیٰ کی حیثیت تبدیل ہو کر ''حجرہ'' بن گئی اور ۹ ماہ کی حکومت کا مثالی منظر تاریخ اسلام میں امر ہو کر روشن باب قرار پایا اور جب اصولوں کی بنیاد پر درویش نے وزارت کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے استعفیٰ دیا تو وقت کا آمر بھی اپنے انجام سے لرز کر منتوں پر اتر آیا۔ استعفیٰ واپس لینے کے لیے خادم الحرمین الشریفین شاہ فیصل، لیبیا کے سربراہ مملکت معمر قذافی اور یاسر عرفات جیسی شخصیات کی سفارشیں لائی گئیں مگر درویش مفتی محمود کے پایہء استقلال میں لغزش نہ آئی اور اصولوں کو فتح مند کر کے اپنوں اور غیروں کی زبانوں پر تالے لگا دیے اور تاریخ اسلام میں اپنے آپ کو امر کر لیا۔

تحریک ختم نبوت، تحریک نظام مصطفیٰ اور جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف تحریک، غرض کوئی ایسا مرحلہ ہمیں مفتی محمود کی زندگی میں نہیں ملتا جس سے آپ کے کردار میں کوئی جھول تلاش کی جا سکے۔

آج ''مفتی محمود'' کی زندگی کے ایک باب کی تقلید کا موقع اس طرح ملا کہ پوری سرحد اسمبلی میری پشت پر ہے۔ تمام مذہبی جماعتیں میری ہم سفر ہیں۔ قومی اسمبلی میں متحدہ مجلس عمل کی بھاری بھرکم قیادت کے علاوہ ۶۰ سے زائد ممبران کی قوت کے بل بوتے پر اور موجودہ

حالات میں سمجھتا تھا میرے لیے وزارت اعلیٰ کی مسند پھولوں کی سیج ہوگی اور میں بہت اطمینان سے صوبہ کو مفتی محمود کے طرز پر چلاؤں گا۔ مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پانچ ماہ گزرنے کے باوجود ہم مفتی محمود کے دور کے برابر ایک انچ بھی کام نہ کر سکے۔ حالانکہ مفتی محمود کی تنہا ذات اور صرف ۳ ممبران قومی اسمبلی کی رفاقت اور مرکز میں ذوالفقار علی بھٹو جیسی مخالف شخصیت اور تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اتنا کام کر لینا ''مفتی محمود'' کی شخصیت کا کمال ہے۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مفتی محمود کی شخصیت پر دیگر پہلوؤں پر تو کچھ نہ کچھ کام ہوا مگر مفتی محمود کے سیاسی نظریات اور خدمات پر کما حقہ کام نہ ہو سکا۔ انور قدوائی صاحب اس بارے میں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مفتی محمود کے اس پہلو پر کام کیا اور محترم ریاض درانی صاحب کی خدمات قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے محنت کر کے انور قدوائی صاحب کو اس کام کی طرف راغب کیا اور اب اس کی اشاعت کی گراں بار ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اور جمعیت علماء اسلام کے تمام عہدیداروں اور کارکنوں کو مفتی محمود کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے اور مفتی محمود کے مشن کو کامیاب فرمائے۔

ایں دعاء از من است　　از جملہ جہاں آمین باد

اکرم خان درانی
وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد

گزارش

مولانا ریاض درانی صاحب جمعیت علماء اسلام کے بڑے متحرک اور فعال سیکرٹری اطلاعات ہیں اور ان کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے مجھ جیسے شخص کو قبلہ مفتی صاحب پر چند صفحات لکھنے پر آمادہ کرلیا۔ عزیز گرامی مولانا فضل الرحمٰن نے بھی کئی بار تقاضا کیا اور یہ میری کوتاہی تھی کہ میں نے قبلہ مفتی صاحب کے بارے میں کچھ کیوں نہ لکھا۔ اگرچہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ قبلہ مفتی صاحب سے نیاز مندی اور عقیدت کا شرف حاصل رہا۔ میں نے قبلہ مفتی صاحب سے جو کچھ سیکھا ان سے سنا اور ان کے حوالے سے دیکھا۔ انہیں الفاظ کی صورت دے رہا ہوں۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا اس کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جو کچھ دیکھا ہے اسے لکھ دوں۔ تاہم اگر کوئی بات درست نہ ہو تو اسے ”وجہ گرفت“ نہ سمجھا جائے کہ میں اب بزرگی میں داخل ہو گیا ہوں۔ تاہم میں اپنے بھائی مولانا فضل الرحمٰن جن سے مجھے یک گونہ محبت اور لگاؤ ہے جنہیں پیر صاحب پگاڑو بڑے پیار سے چھوٹے مفتی کہتے ہیں، کو زبردست خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بڑے باپ کا مشن جاری رکھا اور والد گرامی کی نسبت سے ”بڑے آدمی“ بنے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ قبلہ مفتی صاحب ان کی جدوجہد اور مشن پر جنت الفردوس میں بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ میرے ہونہار بیٹے نے میرا نام روشن کر دیا ہے۔ بڑے لوگوں کی اولاد بہت ہی کم ایسی گزری ہے جو خود بڑی بنی ہو۔ یہ تو ہوا ہے کہ کسی بڑے لیڈر کا بیٹا ان کی خالی

نشست پر کسی اسمبلی کا رکن بن گیا ہو- مدرسہ کا سربراہ ہو لیکن ایسے کم ہیں جو اپنے باپ کے مقام کو پہنچے ہوں- نام لینا مناسب نہیں ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد ہی نہیں پہلے بھی ہمارے جو عظیم اور بڑے لیڈر گزرے ہیں ان میں سے کتنے ہیں جن کی اولاد اپنے باپ کے منصب و مقام تک پہنچی ہے- یہ مولانا فضل الرحمٰن کا اعزاز ہے کہ پدرم سلطان بود تو ہیں- مگر خود بھی سلطان ہیں اور مجھے یہ بھی فخر ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن سے بھی میری بڑی شناسائی ہے- بلکہ یہ ان کی محبت ہے کہ وہ مجھ ناچیز کا اپنے والد گرامی سے نسبت کے حوالے سے بڑا احترام کرتے ہیں اور عزت دیتے ہیں- میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا فضل الرحمٰن کو ان کے مشن و مقصد میں سرخرو فرمائے- وقت کے حکمرانوں نے ان پر الزامات عائد کیے- کئی برے ناموں سے پکارا گیا- یہ بھی دھمکی دی کہ ان کے خلاف تحقیقات کی جا رہی ہیں- اس طرح انہیں بلیک میل کرنے کی سازش بھی ہوئی مگر پیر صاحب پگاڑو کا چھوٹا مفتی ایک پہاڑ کی طرح پرعزم ہے اور ہر مخالف طاقت کے خلاف کھڑا ہوا ہے- قید و بند کی صعوبتیں اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں- میری تمنا ہے کہ ہر بڑے آدمی کی اولاد اس طرح بڑی ہوتا کہ سفر حیات میں کہیں بھی، کبھی بھی، شخصیت کا خلا پیدا نہ ہو-

قبلہ مفتی صاحب کی بھی یہی خواہش اور آرزو تھی کہ ان کا یہ بیٹا بڑا آدمی بنے- خاندان کا نام روشن کرے اور ایسا ہی ہوا ہے- کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ ''چھوٹے مفتی صاحب'' بڑے مفتی صاحب سے آگے نکل گئے ہیں- اگرچہ اس میں تھوڑی بہت صداقت بھی ہے- مگر مشرقی روایت اس کی اجازت نہیں دیتی- مولانا فضل الرحمٰن نے ثابت کیا ہے کہ وہ ایک بڑے آدمی ہیں- اللہ تعالیٰ انہیں اور حوصلہ عطا کرے کہ وہ ملک و دین کی خدمت کر سکیں- مولانا فضل الرحمٰن کی حوصلہ مند قیادت کی بدولت ہی اکتوبر ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں جمعیت علماء اسلام نے سرحد و بلوچستان میں جو فقید المثال کامیابی حاصل کی ہے- یہ قبلہ مفتی صاحب کے مشن کی تکمیل کی جانب ایک قدم ہے کہ ان کے ہونہار صاحبزادے نے اپنے عظیم باپ کے نقش قدم

پر چلتے ہوئے اقتدار کے لیے کسی قسم کی کوئی سودے بازی نہیں کی- جبکہ مسلم لیگ (ق) کی قیادت اور مقتدر حلقوں کی یہ کوششیں اور خواہش تھی کہ متحدہ مجلس عمل سے اشتراک اقتدار کیا جائے لیکن متحدہ مجلس عمل کی قیادت نے اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا- وزارتوں کو ٹھوکر ماردی اور اب مولانا فضل الرحمٰن کی رہنمائی اور قیادت میں سرحد کے وزیراعلیٰ جناب اکرم درانی نے سرحد کو ”اسلامی ماڈل صوبہ“ بنانے کے عزم کا اعلان کیا ہے- اللہ تعالیٰ انہیں سرخرو کرے-

انور قدوائی

حرفِ اول

حضرت مولانا مفتی محمود ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ انہوں نے ملک میں آمریت، شخصی حکومت کے خلاف تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کی قیادت کی۔ یہ وہ تحریک تھی جس کی پوری جمہوری تاریخ میں مثال نہیں ملتی اور یہی وہ تحریک تھی جس نے وقت کے آمر کو عوام کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان عظیم انسانوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ منزل کا تعین کیا اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ راقم الحروف کو ان کی خدمت میں بیٹھنے ان کی گفتگو سننے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ میری متاع حیات بھی ہے۔ یہ بات میرے لیے باعث صد افتخار ہے کہ مولانا صاحب مرحوم راقم الحروف سے بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے اور ناچیز سے کئی معاملات میں نقطۂ نظر بھی پوچھتے اور بعض اوقات دل کی بات بھی کیا کرتے تھے۔ اگرچہ میں اس وقت روزنامہ نوائے وقت کا محض ایک رپورٹر تھا۔ لیکن مفتی صاحب مرحوم نے کبھی اس حیثیت سے نہیں جانا۔ یوں ملتے اور بات کرتے جیسے بزرگ ہوں۔ روزنامہ مارننگ نیوز کے لاہور میں بیورو چیف سید سجاد کرمانی، روزنامہ امروز کے چوہدری خادم حسین (جو آج کل روزنامہ پاکستان کے چیف رپورٹر ہیں) جنگ کے سید فاروق شاہ اور راقم الحروف سے خصوصی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ جب لاہور تشریف لاتے تو ان سے ملاقات رہتی اور ہم ان سے فیض حاصل کیا کرتے۔ ان کی امامت میں نماز ادا کرتے اور کبھی کبھی مفتی صاحب ہمیں ”اندر کی خبر“ بھی دیا کرتے تھے۔ ایک دو نہیں درجنوں بار ایسا ہوا کہ مفتی صاحب کی دی گئی خبر

سارے اخبارات میں ’’لیڈ نیوز‘‘ ہوا کرتی - ’’آف دی ریکارڈ‘‘ باتیں بھی ہوتیں اور انہیں ہم پر اعتماد تھا کہ جو بات آف دی ریکارڈ کی گئی ہے وہ اخبار میں خبر نہیں بنے گی اور ایسا ہی ہوتا تھا- ایسا متعدد بار ہوا کہ مفتی صاحب قبلہ لاہور آئے اور ہم حاضر نہ ہوئے تو استفسار کیا کہ قدوائی اور ان کے ساتھی کہاں ہیں؟ حضرت عبیداللہ انور یا علامہ زاہد الراشدی کو ہدایت کرتے کہ معلوم کرو یہ لوگ کہاں ہے- علامہ زاہد الراشدی فون کرتے اور کہتے کہ ’’بھائی کہاں ہو قبلہ آئے ہوئے ہیں-‘‘ ہم فوراً وہاں پہنچتے تو خیر خیریت دریافت کرتے- علامہ راشدی کو کہتے کہ ان کی خاطر تواضع کرو- بعض اوقات ایسا ہوا کہ جمعیۃ علماء اسلام کی میٹنگ ہو رہی ہوتی - ہم وہاں پہنچتے تو قبلہ مفتی صاحب کو اطلاع دی جاتی یا ہم دروازے سے اندر جھانکتے اور ان کی ہم پر نظر پڑ جاتی تو کمال شفقت فرماتے ہوئے اٹھ کر باہر آ جاتے- مسکراتے ہوئے فرماتے کہ ’’آپ آ گئے ہیں- ہم نے تو چار بجے بریفنگ رکھی ہوئی ہے-‘‘ سجاد کرمانی مرحوم کہتے- (کیونکہ ایسے مواقع پر وہ ہمارے ترجمان ہوتے تھے) کہ جناب کی زیارت کرنی تھی- مفتی صاحب فوراً راشدی صاحب کی ڈیوٹی لگاتے کہ ان کی دیکھ بھال کرو- کئی بار ایسا ہوا کہ کرمانی صاحب نے کہا کہ جناب والا تین بج گئے ہیں اخبارات کا پہلا ایڈیشن جانے والا ہے- آپ چند باتیں بتا دیں- ہماری خبر چلی جائے گی- میرے ذہن میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ہے کہ قبلہ مفتی صاحب نے کبھی انکار کیا ہو- فرماتے اچھا‘ تو پوچھو کیا سوال ہے- ہم دو تین سوال کرتے اور خبر بن جاتی اور قبلہ مسکرا کر اندر چلے جاتے- اب ایسے بڑے لوگ کہاں؟

ہمارا یہ سیاسی المیہ ہے کہ بڑے لوگ رخصت ہو گئے تو چھوٹے بڑے بن گئے لیکن وہ بڑے نہ بن سکے- ایک اور اہم بات یہ کہ قبلہ مفتی صاحب کا یہ حسن تھا کہ وہ جتنی بات کرتے وہ اتنی جامع اور مکمل ہوتی تھی کہ ہمیں الگ سے خبر نہیں بنانی پڑتی تھی- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی میں یہ حسن حد درجہ اتم موجود تھا- وہ اپنی پریس کانفرنس میں سوال کے جواب خبر کی طرح لکھاتے تھے اور اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ سید مودودی بنیادی طور پر صحافی تھے- مجھے ان

سے کئی بار انٹرویو کرنے کا شرف حاصل ہوا- سوال کیا اور جواب لکھوا دیا- جو اتنا جامع اور مفصل ہوتا کہ ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہیں کیا جا سکتا تھا- (یہ خوبی نوابزادہ نصراللہ خاں میں بھی ہے) ورنہ ایسا کوئی سیاست دان میں نے نہیں دیکھا جو "مکمل اور مفصل" ایسی گفتگو پر حد درجہ کمال رکھتا ہو کہ اس کی بات میں کانٹ چھانٹ نہ کی جا سکے- بہت سے بڑے لیڈر ایسے ہیں اور ایسے تھے جو ایک ایک گھنٹہ پریس کانفرنس کرتے تھے اور اب بھی ایسے ہیں- لیکن صحافت کی زبان میں بیشتر گفتگو غیر متعلقہ ہوتی تھی اور اسے خبر بنانی ایک مشکل کام ہوتا- لیکن قبلہ مفتی صاحب ان رہنماؤں میں صف اول پر ہیں جن کی گفتگو مکمل خبر تھی- میں نے کبھی بھی ان کے منہ سے کسی بھی سیاسی مخالف کے خلاف نازیبا الفاظ نہیں سنے اور نہ ہی پڑھے- ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کی انتخابی سرگرمیوں کے دوران اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو بعض لیڈروں کے نام بگاڑ کر ان سے مخاطب ہوتے- ریٹائر ائیر مارشل اصغر کو "آلو" کہہ کر تقریر میں مخاطب کرتے- کبھی قبلہ مفتی صاحب کا نام لے کر سٹیج پر ڈگڈگی بجاتے- پیپلز پارٹی کے کئی لیڈر بدزبانی کرتے- ان میں مرحوم مولانا کوثر نیازی پیش پیش تھے- مولانا نیازی مرحوم، جناب معراج محمد خان بڑے پرجوش خطیب تھے- تقریر کے فن سے آشنا تھے- لیکن قبلہ مفتی صاحب نے کبھی ان تقاریر کا نوٹس نہیں لیا اور کبھی کسی کے خلاف کوئی بات نہ کی- ایک بار مرحوم بھٹو صاحب نے انہیں بازی گر اور ایک اور نازیبا لفظ استعمال کیا- ایک محفل میں قبلہ مفتی صاحب گفتگو فرما رہے تھے تو انہوں نے جناب وزیراعظم کہہ کر بھٹو صاحب کو مخاطب کیا- بات آگے بڑھی تو فرمایا کہ "بھٹو صاحب فرماتے ہیں"- وہاں موجود ایک شخص سے نہ رہا گیا وہ بول پڑا کہ جناب مفتی صاحب بھٹو صاحب تو آپ کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہتے- آپ کی نقلیں اتارتے ہیں اور آپ ہیں کہ انہیں جناب وزیراعظم اور بھٹو صاحب کہہ رہے ہیں- قبلہ مفتی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور کہا کہ "میاں! بھٹو صاحب جو چاہیں کہیں میں ان کی بدکلامی کے جواب میں اپنی زبان کیوں خراب کروں- وہ جو کہتے ہیں ان کو کہنے دو میں تو بھٹو صاحب

ہی کہوں گا۔"

یہ بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ مرحوم مولانا میں ایک اور خوبی یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنی ذات سے بلند ہو کر سیاست کی۔ ملک وقوم کو اولیت دی۔ کوئی ایک واقعہ یا بات میرے علم میں نہیں ہے۔ جب مولانا مرحوم نے اپنی ذات یا مفادات کو قومی مفاد پر ترجیح دی ہو۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے تحریک نظام مصطفیٰؐ میں ظلم و جبر کی انتہا کر دی۔ تحریک کے کارکن بڑی تعداد میں شہید کیے گئے۔ ہزاروں زخمی اور قید ہوئے۔ جیل میں ان پر تشدد کیا گیا اور ایسا سلوک کیا گیا کہ جس کی ملک کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی لیکن مولانا مفتی محمود کو جب بھٹو حکومت نے مذاکرات کی دعوت دی تو مولانا مرحوم اور قومی اتحاد کی قیادت نے ملک وقوم کے عظیم تر مفاد میں اسے مسترد نہیں کیا۔ ملک میں جمہوریت اور ووٹ کے تقدس کی بحالی کے لیے اقدامات کیے۔ جس کے بارے میں قومی اتحاد کی اس وقت کی قیادت آج بھی یہ دعویٰ کرتی ہے کہ مذاکرات کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ مرحوم بھٹو کی غلطی تھی کہ انہوں نے اس کے باضابطہ اعلان میں تاخیر کی اور مرحوم جنرل ضیاء الحق کو شب خون مارنے کا موقع مل گیا۔ مرحوم بھٹو نے معاہدہ پر دستخط کرنے میں تاخیر کیوں کی۔ اس بارے میں تاریخ خاموش ہے کہ مرحوم بھٹو کے کسی ساتھی نے ابھی تک اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ جناب عبدالحفیظ پیرزادہ بھٹو مذاکراتی ٹیم کے اہم رکن تھے ان کا یہ تاریخی فرض ہے کہ اس پر روشنی ڈالیں۔ جب قومی اتحاد اور حکومت کے درمیان تمام امور پر اصولی طور پر اتفاق ہو گیا تھا اور اس کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارک باد بھی دے دی گئی۔ تو اس پر باضابطہ دستخط کرنے کے بجائے مرحوم بھٹو مسلم ممالک کے دورے پر چلے گئے۔ واپس آئے تو ان سے کہا گیا کہ وقت تیزی سے آگے جا رہا ہے۔ قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے جلد دستخط کرنے پر اصرار کیا تو جواب ملا کہ کل معاہدہ ہو جائے گا اور کل نہ آئی بلکہ ملک ایک طویل مارشل لاء کی لپیٹ میں آ گیا۔

آخری ملاقات

یہ جمعرات ۲۵ ستمبر کی شام کا ذکر ہے۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا خبر بنا رہا تھا کہ صحافتی زبان میں ایسا ہی کہتے ہیں، ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری جانب سے پوچھا گیا کہ انور قدوائی صاحب ہیں۔ میں نے کہا کہ عرض کر رہا ہوں۔ فون کرنے والے نے پیغام دیا کہ مولانا مفتی محمود صاحب لاہور آ رہے ہیں۔ کل نماز جمعہ سے قبل شیرانوالہ گیٹ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے میں حاضر ہو جاؤں گا اور فون بند کر کے پھر خبر کی نوک پلک سنوارنے میں لگ گیا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اپنے ساتھی سعید آسی سے کہا کہ فون سنو۔ آسی صاحب نے فون اٹھا کر بات کرنی شروع کر دی اور پھر فون میری جانب بڑھا دیا کہ جناب نثار عثمانی صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ (نثار عثمانی صاحب ہمارے سب کے بزرگ تھے اور لاہور میں ڈان کے بیورو چیف ہوا کرتے تھے۔ وہ وضعدار، محبت کرنے والے شخص تھے اور یہ کہ اول و آخر اخبار نویس تھے۔ وہ ایسے بڑے صحافی تھے جنہیں ایوان اقتدار کے برامدوں میں چہل قدمی کا شوق نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے وقت کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ سچے اور کھرے صحافی تھے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ لفٹ کا ذہن رکھتے تھے۔ لیکن میرا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ ایک پکے باعقیدہ مسلمان تھے۔ انہیں پاکستان اور قوم سے محبت تھی بات نثار عثمانی کے فون کی تھی کہ ان کا ذکر آیا تو یہ باتیں ہو گئیں کہ مرحوم نثار عثمانی کو ان کی برادری بھی بھول گئی کہ جب ملک میں مارشل لا نافذ

تھا اور ہر سمت ہو کا عالم تھا تو یہ نثار عثمانی ہی تھے جنہوں نے لاہور میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کی پہلی پریس کانفرنس میں ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی تھی۔) فون پر جناب عثمانی صاحب نے کہا کہ شیرانوالہ گیٹ سے فون آیا ہے کہ مفتی صاحب قبلہ نے مجھے اور آپ کو کل دوپہر کھانے پر مدعو کیا ہے۔ کیا وہاں کوئی میٹنگ ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے علم نہیں۔ کہنے لگے تو ٹھیک ہے ساڑھے گیارہ بجے چلیں گے۔ میری طرف آ جانا۔ اگلے روز جمعہ تھا میں اور عثمانی صاحب رکشہ لے کر حضرت عبیداللہ انور کی اقامت گاہ جا پہنچے۔ اطلاع کرائی تو مولانا اجمل قادری باہر آئے اور فرمایا کہ قبلہ مفتی صاحب جمعیت علماء اسلام کے چند رہنماؤں سے میٹنگ کر رہے ہیں۔ ہدایت کی ہے کہ آپ کو عبدالحمید بٹ کے گھر پہنچا دیا جائے۔ جناب بٹ صاحب کا گھر مولانا عبیداللہ انور کی اقامت گاہ کے سامنے ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو عبدالحمید بٹ پہلے ہی منتظر تھے۔ چند ساعتوں کے بعد قبلہ مفتی صاحب تشریف لے آئے۔ فرشی نشست تھی۔ بٹ صاحب سے کہا کہ بھئی ان کے کھانے کا انتظام کیا ہے، لے آؤ۔ قبلہ مفتی صاحب ذیابیطس کے مریض تھے اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ بٹ صاحب نے بتایا کہ عثمانی صاحب اور میرے لیے فرمائش کر کے قبلہ مفتی صاحب نے مرغی پکوائی تھی۔ آلو گوشت کا سالن بھی تھا۔ قبلہ مفتی صاحب نے محبت و شفقت فرماتے ہوئے اپنے ہاتھ سے ہماری پلیٹوں میں خود سالن ڈالا۔ عثمانی صاحب سے کہنے لگے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم نے بڑا صبر کیا ہے۔ جبکہ ضیاء الحق صاحب نے نہ صرف ہم سے وعدہ خلافی کی۔ بلکہ قوم کو دھوکہ دیا ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ میں نے آپ دونوں کو صرف اس لیے بلایا ہے کہ اولاً آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔ دوسرے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر اب میں نے حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا تو یہ درست نہیں ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ تحریک نظام مصطفیٰ کامیاب ہو گئی تھی۔ بھٹو صاحب نے تمام باتیں مان لی تھیں۔ لیکن سارے ہی ساتھی (جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے ۳ پارٹیوں کا ذکر کیا تھا) تھے جنہوں

نے وفا نہیں کی۔ ایک قائد نے تو آپ کو علم ہے فوج کے نام کھلا خط لکھ دیا۔ ایک اور پارٹی تھی جس نے بات کر لی تھی۔ قبلہ مفتی صاحب اس بات پر خاصے افسردہ تھے کہ جنرل ضیاءالحق نے قومی اتحاد کی قیادت کو دھوکہ دیا۔ غلط بیانی کی وعدے کیے اور بعد میں ان سے منحرف ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے اپنے ساتھیوں سے مشاورت کی ہے اور سب اس بات پر متفق ہیں کہ صدر ضیاءالحق کے خلاف تحریک چلائی جائے اور انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ ملک میں جمہوریت بحال کریں۔ نظام مصطفیٰ نافذ کریں۔ انہوں نے بتایا کہ جنرل ضیاءالحق سیاست دانوں کی خرید وفروخت میں مصروف ہیں۔ صوبوں کے فوجی گورنروں کی ڈیوٹیاں لگائی گئیں ہیں کہ وہ سیاست دانوں سے رابطے کریں۔ وزارت کی لالچ دی جائے۔ ''عثمانی صاحب! جنرل ضیاءالحق الیکشن نہیں کرائے گا۔ کسی نہ کسی طرح کا سلیکشن ہوگا اور خود صدر بن کر بیٹھ جائے گا۔

''مجھے بھی ملاقات کے لیے پیغامات آ رہے ہیں۔ گزشتہ ماہ میرے گھر آنے کے لیے بے تاب تھے۔ میں نے دوٹوک الفاظ میں انکار کر دیا۔''

عثمانی صاحب نے کہا کہ قبلہ آپ نے خود انہیں اقتدار دیا۔ ان کی فوجی حکومت میں وزیر بنے۔ غلطی تو آپ کی تھی۔ اصغر خان، نورانی میاں آپ سے الگ ہو گئے۔ مسلم لیگ کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ اب اگر آپ تحریک چلانے کی بات کرتے ہیں تو آپ کے ساتھ کون ہوگا؟ قبلہ مفتی صاحب نے کہا کہ یہی تو سوچنے کی بات ہے کہ کون ساتھ چلے گا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ رابطے کریں۔ نوابزادہ نصراللہ خان صاحب بات کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دینی جماعتوں کو اکٹھا کروں۔ ہم تو اپنا کام کریں گے کوئی ساتھ نہیں دیتا نہ دے۔ ہم اپنا فرض تو پورا کریں گے۔

میں نے عرض کیا کہ قبلہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شوگر کی بیماری میں آرام بھی پرہیز میں شامل ہے۔ علاج ومعالجہ پر توجہ دیں۔ کہنے لگے کہ اب پرہیز بھی کر رہا ہوں اور علاج بھی جاری ہے اور یہ طے پایا کہ حج سے واپسی پر ایک اور ملاقات ہوگی۔ اس وقت تک صورت

حال کچھ واضح ہو جائے گی۔ ہم بٹ صاحب کے گھر سے اکٹھے نکلے اور مسجد میں آ گئے۔ قبلہ مفتی صاحب اندر چلے گئے۔ میں اور عثمانی صاحب وضو کرنے لگے بعد میں مسجد میں جا کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ قبلہ مفتی صاحب خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو ہماری جانب نظر گئی۔ لاؤڈ سپیکر پر ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اگلی صف میں ادھر آ جائیں اور خطبہ میں یہ واقعہ سنایا کہ سرحد کے گورنر جنرل فضل حق میرے پاس آئے کہ صدر جنرل ضیاء الحق مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ جنرل فضل حق میرے پرانے ملنے والے ہیں۔ کہنے لگے کہ جنرل صاحب آپ کے گھر آنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں جنرل ضیاء الحق سے نہیں ملنا چاہتا۔ انہوں نے مجھ سے ہی نہیں پوری قوم سے وعدہ خلافی کی ہے۔ جنرل فضل حق کہنے لگے کہ دیکھیے مولانا صاحب جنرل ضیاء الحق اسلام اور اسلامی نظام کی بات تو کرتے ہیں۔ وہ پانچ وقت کے نمازی ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں۔ جبکہ پہلے حکمران تو اسلام کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ ہاں یہ درست ہے کہ جنرل ضیاء الحق نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ ساری قوم کو گٹر میں پھینک دیا ہے اور ڈھکنا بند کر کے اس پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی ہے۔ آپ درست کہتے ہیں کہ وہ نماز پڑھتے ہیں لیکن یہ ہے جنرل ضیاء الحق کی نماز کہ اس نے قوم کو دھوکہ دیا ہے۔ مولانا مفتی محمود کی گرجدار آواز گونجی اور انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ان طاقتوں کے خلاف میدان عمل میں نکل آئیں جو ملک میں اسلام اور اسلامی اقدار کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ قبلہ مفتی صاحب نے جامع مسجد شیرانوالہ میں نماز کی امامت بھی فرمائی۔ نماز کے بعد انہوں نے مسجد کی سیڑھیوں تک آ کر ہمیں رخصت کیا۔ مجھے پیار سے گلے لگایا۔ میں نے درخواست کی کہ خانہ کعبہ اور روضہ رسولؐ پر دعا فرمائیں۔ واپسی پر نثار عثمانی صاحب کہنے لگے کہ مولانا بڑے برہم ہیں۔ لگتا ہے کہ حج عمرہ سے واپسی کے بعد ایک اور تحریک نظام مصطفیٰ چلے گی۔

۱۴ اکتوبر

قبلہ مفتی محمود صاحب ہفتہ کو لاہور سے براستہ ملتان کراچی چلے گئے اور پروگرام یہ تھا کہ چند روز قیام کے بعد حج کی سعادت حاصل کرنے جدہ جائیں گے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ اس کی مشیت کے آگے سب بے بس ہیں۔ جو اس جہان فانی میں آیا ہے اس نے واپس بھی جانا ہے کہ یہ نظام قدرت ہے اس جہاں میں نہ پیدائش کوئی انہونی ہے نہ موت کوئی عجوبہ لیکن چند خوش بخت ایسے ہیں جب دنیا میں آتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ چمن میں بہار آ گئی ہے۔ وہ سفر حیات میں اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ملک و قوم کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ چند ایسے عظیم ہیں کہ انہیں تاریخ کا روشن باب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ایسے بھی ہیں جو تاریخ میں عبرت بن جاتے ہیں۔ لیکن عظیم تر وہ ہیں جن سے تاریخ منسوب ہوتی ہے وہ تاریخ ساز کہلاتے ہیں۔ ان کے کارنامے قوموں کے لیے مشعل راہ بنتے ہیں کہ جب ایسے لوگ بچھڑتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ نبض کائنات تھم گئی ہے۔ ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔

۱۴- اکتوبر کو میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ میرے نیوز ایڈیٹر طارق وارثی نے اونچی آواز میں کہا کہ ‘‘قدوائی صاحب! مولانا مفتی محمود انتقال کر گئے ہیں۔’’ میرے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ میں بھاگ کر نیوز روم میں پہنچا کہ وہ خبر دیکھ سکوں جو پی پی آئی کے ٹیلی پرنٹر سے موصول ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں فیکس، ای میل، کمپیوٹر کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ نیوز ایجنسیوں کے

ٹیلی پرنٹر ہوتے تھے جس پر خبریں آتی تھیں۔ مختصر سی خبر تھی، تفصیل آرہی تھی۔ میری آنکھوں سے ضبط کے باوجود بے ساختہ آنسو بہہ نکلے کہ ان سے ایک تعلق تھا، عقیدت تھی، محبت تھی اور آخری ملاقات آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ جب واپس کمرے میں پہنچا تو سب سے پہلا فون نثار عثمانی صاحب کا تھا۔ کہنے لگے کہ کیا ہوا پوری خبر پتہ کر کے بتاؤ اور جمعہ کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قدوائی صاحب میں نے اپنی طویل صحافی زندگی میں بڑے بڑے حکمرانوں، سیاست دانوں سے ملاقات کی۔ غیر ملکی سربراہوں کے انٹرویو کیے ہیں۔ لیکن مولانا مفتی محمود جیسا عظیم اور بڑا کسی کو نہیں پایا کہ یہ سچ بھی ہے۔ تعزیتی بیانات کا سلسلہ شروع ہوا سعید آسی صاحب نے نوابزادہ نصر اللہ خان سے بات کی ان کا کہنا تھا کہ نوابزادہ صاحب کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے ان کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہوں اور کیوں نہ ہوتا کہ نوابزادہ صاحب اور مولانا مفتی محمود کا ایک عمر کا ساتھ تھا اور قومی اتحاد کی تحریک میں دونوں لازم وملزوم تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نوابزادہ صاحب مولانا مفتی محمود کا بڑا احترام اور ان سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ مولانا مفتی محمود کا بھی یہی عالم تھا جب بھی کوئی اہم مسئلہ ہوتا تو وہ نوابزادہ صاحب سے نہ صرف مشورہ فرماتے بلکہ اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ سیاست دان، حکمران لیڈر کی وفات پر روایتی طور پر یہ جملہ کہتے اور کالم نگار، رپورٹر یہ لکھتے ہیں کہ ”ان کی وفات سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ایک مدت پر نہیں ہوگا“ لیکن مولانا مفتی محمود کے حوالے سے یہ حقیقت ہے کہ ان کے جہان فانی سے رخصت ہونے کے بعد سیاسی، دینی سطح پر جو خلا پیدا ہوا تھا وہ کبھی بھی پر نہیں ہو سکے گا کہ ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اقدار، وہ روایات، وہ رکھ رکھاؤ آج کے معاشرہ میں ختم ہو گیا ہے۔ مولانا مفتی محمود کی وفات کے بعد جنرل ضیاء الحق کے خلاف ایم آر ڈی بنی تو لیکن اتنے زور کی تحریک نہیں چل سکی جس سے وقت کے حکمران کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکتا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان نے جمہوریت کی بحالی کے لیے بہت سی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر لیا۔ لیکن مفتی محمود کی قیادت کا خلا پر نہیں ہو سکا۔ ان کی

موت سے ملک ایک قائد سے محروم ہو گیا - ایسے لیڈر سے جو چٹائی پر بیٹھ کر حکومتی فیصلے کیا کرتا تھا جسے اپنی درویشی پر فخر تھا۔ جس نے ساری زندگی ایک اعلیٰ مقصد کے لیے وقف کر دی اور وہ مقصد یہ تھا کہ ان کی آرزو، خواہش اور تمام تر جدوجہد یہ تھی کہ اللہ کے نام پر حاصل ہونے والے اس ملک میں اللہ کی حکومت، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام نافذ ہو سکے اور جب وہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو اس کے باوجود کہ عبدالولی خان کی جماعت نیشنل عوامی پارٹی مخلوط حکومت میں بڑی پارٹی تھی اور جناب ولی خان کے بارے میں یہی تاثر ہے کہ وہ سیکولر ذہن کے لیڈر ہیں۔ مولانا مفتی محمود نے اپنے صوبہ میں اسلامی اقدار و نظام کو نافذ کرنے کی ایسی کامیاب کوششیں کی کہ اسلامی دنیا نے اس پر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ مولانا مفتی محمود اور ان کے رفقاء ملک میں نظام مصطفیٰ ؐ کے نفاذ کے حامی تھے اور قومی اتحاد کی تحریک نظام مصطفیٰ ؐ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ پاکستان کے عوام کی اکثریت اسلامی نظام کی حامی ہے کہ تحریک میں جس جوش و جذبہ کا مظاہرہ کیا گیا جس طرح عوام نے جان و مال کی قربانیاں دیں وہ ان کے اعلیٰ مقاصد سے وابستگی اور جذبہ ایمان کی آئینہ دار تھی اور مولانا مفتی محمود اس حوالے سے ”خوش بخت“ ہیں کہ انہوں نے اپنی موت تک اس اعلیٰ مقصد کے لیے جدوجہد کی اور ایک ”روشن مشن“ چھوڑ گئے کہ جس کا حصول مولانا مرحوم کا قوم پر قرض ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ کا اعزاز

حضرت قائداعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خان کے بعد پاکستان کی سیاست میں اقتدار کے لیے ”سانپ سیڑھی“ کا کھیل شروع ہوا۔ سیاست دان کوئی بھی ہو اس نے اقتدار کے حصول اور اسے دوام دینے کے لیے سب کچھ کیا۔ اصولوں کو اقتدار کی چوکھٹ پر قربان کر دیا گیا۔ ”پلاٹ پرمٹ“ کی سیاست ہوئی۔ ہارس ٹریڈنگ ایسی ہوئی کہ ساری دنیا میں پاکستان بدنام ہوا کہ ارکان کی وفاداریاں خریدنے کے لیے ”مصر کا بازار“ لگا اور ان ارکان کی بھرے بازار بولیاں لگائی گئیں۔ یہ پاکستانی جمہوریت کا ہی کمال ہے کہ مشرقی پاکستان اسمبلی میں ڈپٹی سپیکر شاہد کو راڈ آف آنر مار کر شہید کر دیا گیا۔ اقتدار کے سانپ سیڑھی کے کھیل میں یہ بھی ہوا کہ مشرقی پاکستان میں ابو حسین سرکار کی حکومت کی مدت صرف ”چند گھنٹے“ تھی۔ اقتدار کے لیے نظریاتی مملکت میں قومیت کے نعرے لگائے گئے۔ مقصد صرف اور صرف اقتدار کو دوام دینا تھا۔ چند ایک جو اصولوں کی سیاست کے حامی و داعی تھے ان پر قصر سیاست کے دروازے بند کر دیے گئے۔ جو بولا اسے قید میں ڈال دیا گیا۔

کسی نے بھی جمہوریت، جمہوری روایات اور اخلاقی اقدار کا خیال نہ کیا۔ آئین و قانون کو پامال کیا گیا۔ صدر ایوب کا صدارتی الیکشن یا کوئی اور حکمران سب نے اقتدار کے لیے دھونس اور دھاندلی کا سہارا لیا۔ ہر حربہ استعمال کیا نوابزادہ لیاقت علی خان کے دور میں پنجاب میں جو انتخابی دھاندلی ہوئی اسے ”جھرلو“ کا نام دیا گیا اور سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ جو بھی

راج سنگھاسن پر بیٹھا۔ اس نے کرسی چھوڑنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کو بچانے کے لیے لاکھ جتن کیے۔ ایوب مارشل لاء دور میں مشرقی پاکستان کے ماہر قانون پرنسپل ابراہیم وزیر قانون ہوا کرتے تھے۔ وہ پاکستان میں پہلی مثال ہیں جنہوں نے اصولی اختلاف پر وزارت کو ٹھوکر ماردی تھی۔ لیکن کوئی ان کا نام نہیں جانتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جناب ابراہیم کوئی بڑے سیاسی لیڈر نہ تھے۔ ڈھاکہ لاء کالج کے سابق پرنسپل تھے۔ تاہم پاکستان کی سیاست میں مولانا مفتی محمود کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ جب بھٹو مرحوم نے جبراً بلوچستان میں سردار عطاء اللہ مینگل کی منتخب حکومت کو برطرف کیا تو ان کے اس غیر جمہوری غیر آئینی اقدام پر احتجاج کرتے ہوئے۔ مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ کھلی حقیقت ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو چاہتے تھے کہ مولانا مفتی محمود استعفیٰ نہ دیں۔ انہوں نے اس بارے میں انہیں پیغام بھیجا اور ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن حضرت مولانا نے ملاقات کی تجویز مسترد کردی اور کہا کہ ''ہم آئین کے پابند ہیں اور اس کی بالادستی کا حلف لیا ہے۔ اس لیے غیر آئینی اقدام کی حمایت یا اسے درست قرار دینا حلف کی خلاف ورزی ہے۔ وہ کوئی اور ہوں گے جنہیں اقتدار سے پیار ہے۔ میں ایسا نہیں کرسکتا اور استعفیٰ دے کر اپنے گھر چلے گئے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی ملک کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ اقتدار چھوڑنا مشکل کام ہے۔ ہمارے ملک میں تو کسی نے ایسا نہیں کیا۔ بھٹو مرحوم ہوں یا ان کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو یا میاں نواز شریف کسی نے رضا کارانہ طور پر کرسی نہیں چھوڑی۔ جب بھٹو مرحوم کے خلاف تحریک چل رہی تھی تو ایک پریس کانفرنس میں اپنا ہاتھ کرسی پر مارتے ہوئے جناب بھٹو نے فرمایا تھا کہ ''میری کرسی بڑی مضبوط ہے'' ایک بار ارشاد ہوا کہ ''اگر مجھے ہٹایا گیا تو ہمالیہ روئے گا۔''

صدر ضیاءالحق نے جب غیر جماعتی انتخاب کرانے کا فیصلہ کیا تو انہیں اپنی اس اسمبلی پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ قانون اور آئین کو فراموش کر کے ایک نام نہاد ریفرنڈم کرایا گیا اور اس کی

بنیاد پر وہ ۵ سال کے لیے صدر منتخب ہو گئے۔

صدر سردار فاروق لغاری نے اس وقت کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو ایوان صدر میں طلب کر کے انہیں مشورہ دیا کہ وہ استعفیٰ دے دیں۔ لیکن محترمہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور پھر جو کچھ ہوا سب کے سامنے ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے صدارتی انتخاب میں دھاندلی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ پہلے بنیادی جمہوریت کا ایک نظام مرتب کیا گیا جسے صدارتی الیکٹرول کالج قرار دیا گیا۔ مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ صدارتی انتخاب میں ان کے مدمقابل کوئی نہ ہو۔ جب مادر ملت فاطمہ جناح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بقول قضا کا تیر بن کر ان کے سامنے آ گئیں تو پہلے بعض لیڈروں کو خریدنے کی کوشش کی گئی۔ چند ایسے بھی تھے جو مادر ملت کے کیمپ سے ادھر گئے تھے۔ لیکن مادر ملت کو شکست دینا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن ایوب خان نے ہر قیمت پر کامیابی کا فیصلہ کیا اور ایسا ہی ہوا۔

یہ سچ ہے کہ جنرل یحییٰ خان صدر رہنا چاہتے تھے اس حوالے سے اکثریتی پارٹی کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن سے سودے بازی کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی اور شیخ مجیب الرحمان کو اقتدار نہ دیا۔ بلکہ ملک دولخت ہو گیا اس کی اور بھی بہت سی وجوہات ہوں گی لیکن سب سے بڑی اور اہم وجہ کرسی اقتدار تھی۔ ایسے ماحول اور سیاسی کلچر میں اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی وزیر اعلیٰ اقتدار خود چھوڑ دے۔ یہ اعزاز مولانا مفتی محمودؒ کو حاصل ہے کہ انہوں نے غیر آئینی اقدام پر احتجاج کیا اور وزارت اعلیٰ کو ٹھوکر مار دی اور یہ یوں ممکن ہوا کہ انہوں نے وزارت اعلیٰ سے کوئی مادی، سیاسی فائدہ نہیں اٹھایا۔ سرکاری کار، دفتر کے لیے ضرور استعمال کی کہ اس کی ضرورت تھی۔ مگر کوئی تنخواہ اور مراعات حاصل نہیں کیں۔ وزارت اعلیٰ کے منصب کو عوام کی امانت جانا اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ صوبہ پنجاب میں غلام حیدر وائیں ایک کارکن وزیر اعلیٰ تھے جن کا متوسط طبقے سے تعلق تھا۔ بلکہ دعویٰ تھا کہ صوبہ کے غریب ترین وزیر اعلیٰ ہیں۔ ایک تقریب میں ملک معراج خالد، حنیف رامے اور وہ شریک تھے جس میں

انہوں نے ان دونوں سابق وزرائے اعلیٰ سے یہ تسلیم کروایا کہ وائیں صاحب ان کے مقابلے میں غریب ہیں۔ معراج خالد اور حنیف رامے بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن جب منظور وٹو نے ان کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی اس وقت پنجاب اسمبلی کے ارکان کی اکثریت ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی اور وجہ یہ تھی کہ میاں نواز شریف کی وزارت عظمیٰ ختم کی جا چکی تھی۔ اس وقت وائیں صاحب مرحوم کو مشورہ دیا گیا کہ وہ استعفیٰ دے دیں۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور تحریک کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا جبکہ انہیں بھی غیر آئینی اقدام کا سامنا تھا۔

مولانا مفتی محمود کے اس اقدام پر انہیں اس طرح خراج تحسین پیش نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے کہ

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

درویش وزیراعلیٰ[1]

وزیراعلیٰ بننے کے بعد حضرت مفتی محمود پہلی بار لاہور آئے تو شیرانوالہ گیٹ میں جمعیت علماء اسلام کی عاملہ کے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ ہم نے جمعیت آفس سے ان کے پروگرام کے بارے میں پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ مولانا صاحب رات ہی واپس جا رہے تھے۔ جناب نثار عثمانی اور سجاد کرمانی نے کہا کہ اسی وقت چلو۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا چنانچہ پانچ چھ صحافی وہاں پہنچ گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ میٹنگ کے بعد کھانا ہے اور مولانا صاحب فوراً روانہ ہو جائیں گے۔ ان کے پی اے نے بتایا کہ اسلام آباد میں کوئی اہم میٹنگ ہے۔ ہم نے حضرت مولانا سے ملاقات کی درخواست کی تو جواب ملا کہ اس قت ایسا ممکن نہیں ہے۔ چند دن بعد تشریف لائیں گے تو آپ سے ملاقات کرائی جائے گی۔ چند ایک تقاریب بھی ہیں۔ ہم نے کہا کہ چند منٹ بات کروا دیں لیکن ادھر سے یہی جواب تھا کہ ''آج ایسا ممکن نہیں ہو سکتا'' حضرت زاہد الراشدی سے ہماری بڑی محبت ہوا کرتی تھی ان سے امداد طلب کی۔ پہلے وہ بھی اپنی روایتی مسکراہٹ سے ہمیں ٹالنے کی کوششیں کرتے رہے۔ جب نثار عثمانی صاحب نے کہا کہ دیکھیں ہم بڑی دور سے اسی لیے آئے ہیں تو یہ وعدہ کر کے اندر چلے گئے کہ ''میں کوشش کرتا ہوں''

حضرت مولانا عبیداللہ انور کی رہائش گاہ پر یہ اجلاس ہو رہا ہے۔ بڑے کمرے سے ملحقہ ایک سٹور نما کمرہ تھا مجھے یاد ہے کہ اس کمرے میں لحاف وگدے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ روشنی بھی برائے نام تھی اور بیٹھنے کی جگہ تو دور کی بات ہے کھڑے ہونا بھی مشکل تھا۔ مولانا زاہد الراشدی نے ہمیں اس کمرے میں لا کھڑا کیا اور کہا کہ حضرت صاحب صرف چند منٹ کے لیے یہاں آئیں گے۔ اندازہ لگائیں یہ سرحد کا وزیراعلیٰ اور ایک تنگ و تاریک کمرے میں

صحافیوں سے ملاقات کے لیے تشریف لائے- ابھی چند سیکنڈ ہی گزر رہے تھے کہ حضرت مولانا مفتی محمود تشریف لائے، خیر خیریت پوچھی- ابھی تک میرے ذہن پر ان کا حلیہ نقش ہے- مولانا نے سفید کرتا شلوار پہن رکھی تھی- دستار سنہری پھولدار تھی جیسی مولانا فضل الرحمٰن پہنتے ہیں اور کندھے پر روایتی چیک والا رومال ڈال رکھا تھا- مجھے یاد ہے کہ مولانا مرحوم کی شلوار میلی تھی اور رومال بھی ایسا ہی تھا- اگرچہ مولانا مرحوم جلدی میں تھے لیکن ہمارے سوالات کے جواب دیے اور اس پر معذرت کی کہ ایسے کمرے میں کھڑے ہو کر بات کی گئی ہے- جب ہم باہر نکلے تو مولانا روانگی کے لیے کار میں بیٹھ رہے تھے- آگے پیچھے پولیس سکواڈ ہرگز نہیں تھا اور کوئی لاؤ لشکر بھی نہیں تھا جو ہم حکمرانوں کے ساتھ دیکھتے رہے ہیں- دو محافظ ضرور تھے جو ایک دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے- جناب نثار عثمانی نے برجستہ کہا کہ ایسا وزیر اعلیٰ ہو تو اسے کوئی دبا اور جھکا نہیں سکتا- یہی شخص ہے جو بھٹو صاحب سے ٹکرا سکتا ہے- ذوالفقار علی بھٹو کی مرکز میں حکومت تھی- ایسی حکومت جسے ہر صورت ''مادر پدر آزاد'' حکومت کہا جا سکتا ہے- بھٹو صاحب کے منشور کا نعرہ تھا اسلام ہمارا دین ہے- سوشلزم ہماری مشیت اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں-

بھٹو صاحب کے ایک وزیر شیخ رشید بابائے سوشلزم کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے- ملک بھر میں شراب خانے آباد تھے جوئے کو قانونی حیثیت حاصل تھی- کراچی، لاہور میں ایسے ریستوران موجود تھے جہاں رقص و سرود عام تھا- اسلام صرف دین کی حد تک تھا اور تمام غیر اسلامی حرکات عام تھیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی- ایسے حالات میں مولانا مفتی محمود نے برسر اقتدار آتے ہی صوبہ سرحد میں شراب پر پابندی عائد کر دی- سرحد میں رہنے والے اسلام آباد اور راولپنڈی آ کر شراب سے لطف اندوز ہوتے تھے- مولانا مفتی محمود کے اس اقدام پر وفاقی حکومت نے شدید برہمی کا اظہار کیا- لیکن بے بس یوں تھے کہ یہ صوبائی معاملہ تھا اور صوبہ کے وزیر اعلیٰ کو ایسا کرنے کا اختیار حاصل تھا- یہ امر قابل ذکر ہے کہ وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھانے کے بعد مولانا مفتی محمود کا یہ پہلا حکم تھا- اس حکم کا نہ صرف پاکستان بلکہ عالم

اسلام میں بھرپور خیر مقدم کیا گیا۔ لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی نے اس اقدام پر مولانا مفتی محمود کو ایک مراسلہ ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ

> ”میں شراب پر پابندی کے بارے میں آپ کے جرأت مندانہ اقدام
> پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اسلامی اقدار کے احیاء اور سربلندی کے لیے
> آپ کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔“

رابطہ عالم اسلامی کے صدر شام کے سابق وزیراعظم ڈاکٹر معروف دوالبی نے جو ان دنوں پاکستان کے دورہ پر تھے مولانا مفتی محمود سے ملاقات کی اس اقدام پر مبارک باد دیتے ہوئے اس یقین کا اظہار کیا کہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے میں بھرپور کوششیں کریں گے۔

ایک اور اہم کارنامہ صوبہ سرحد میں اردو کو سرکاری زبان قرار دینا تھا۔ ایک حکم کے ذریعہ تمام سرکاری خط و کتابت اور دفتری کام اردو میں کر دیا گیا۔ ہر طرح کے جوئے پر پابندی عائد کر دی۔ پاکستان میں پہلی بار صوبہ سرحد میں کالج، یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے قرآن ناظرہ اور ترجمہ کے ساتھ نماز یاد ہونے کو لازمی قرار دے دیا گیا۔ اگرچہ صوبہ کے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے انہیں یہ سب کچھ کرنے کا اختیار تھا مگر وفاقی حکومت کے لیے یہ اقدامات خطرہ کا سبب تھے کہ لوگ یہ کہنے اور مطالبہ کرنے میں حق بجانب تھے کہ وفاقی حکومت ایسا کیوں نہیں کرتی جب ایک صوبہ کا وزیراعلیٰ کامیابی سے یہ سب کچھ کر رہا ہے تو مرکز میں عملی اقدامات کا مظاہرہ کرے اور یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو کو اس پر شدید اعتراض تھا۔ چنانچہ معراج محمد خان، حفیظ پیرزادہ کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ سرحد میں جا کر صوبہ کے وزیراعلیٰ کے خلاف تقاریر کریں اور ایسا ہی ہوا۔ معراج خان نے تو مولویوں کے خلاف پر جوش تقاریر کیں۔ خوب لے دے ہوئی۔ یہ کہا گیا کہ مولانا مفتی محمود ان کو لگام دیں۔ لیکن مولانا صاحب نے انہیں کھلی چھٹی دے دی۔ سرحد پیپلز پارٹی نے بھی ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ وزیراعلیٰ قاعدہ قانون کی پابندی نہیں کر

رہا- یہ وفاقی امور میں مداخلت ہے- مولانا مفتی محمود صاحب نے میرٹ سسٹم کو بھی نافذ کیا تا کہ مستحق اور اہل لوگوں کو روزگار مل سکے- تعلیم کے لیے غریب بچوں کو داخلہ دیا جا سکے-

مولانا مفتی محمود نو ماہ تک وزیر اعلیٰ رہے اور اس ساری مدت میں صوبہ سرحد میں ایک دن کے لیے دفعہ ۱۴۴ نافذ نہیں کی گئی- جبکہ دوسرے صوبوں کا حال یہ تھا کہ ایک دن کے لیے بھی دفعہ ۱۴۴ نہیں ہٹائی گئی- بھٹو صاحب کے تمام دور میں ایمرجنسی نافذ رہی- جلسے جلوس کی اجازت نہیں تھی جبکہ صوبہ سرحد میں سب کو اظہار رائے کی آزادی تھی- اخبارات پر کوئی پابندی نہیں تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ ایک بھی سیاسی قیدی نہیں تھا- صوبہ کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے مولانا مرحوم کا یہ ریکارڈ ہے ایک بھی پلاٹ کسی کو الاٹ نہیں کیا- کسی کو پرمٹ نہیں ملا اور سیاسی بنیاد پر جنگل کے ٹھیکے سیاسی کارکنوں کو نہیں دیے گئے- آج بھی سرحد کے لوگ مولانا مفتی محمود کے دور کو ‘‘سنہری دور’’ کے طور پر یاد کرتے ہیں- صوبہ میں درویش وزیر اعلیٰ کے ‘‘اچھے کام’’ مثال بن گئے تھے اور اب بھی مثال ہیں کہ ان کے بعد کسی بھی وزیر اعلیٰ نے ایسے اچھے کام نہیں کیے اب مولانا مفتی محمود کی جماعت ایک بار پھر سرحد میں برسر اقتدار آئی ہے اور جمعیت علماء اسلام کے اکرم درانی وزیر اعلیٰ بنے ہیں انہوں نے مولانا مرحوم کے مشن کو آگے آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اردو ایک بار پھر صوبہ میں سرکاری زبان بن گئی ہے۔ کیبل ٹیلی ویژن پر پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ آج کل کیبل کے ذریعہ عریاں اور قابل اعتراض فلمیں چلائی جا رہی ہیں۔ جناب اکرم درانی صوبہ میں اسلامی احکامات نافذ کرنے کے لیے اقدامات کر رہے ہیں تا کہ صوبہ سرحد کو ایک بار پھر مثالی صوبہ بنایا جا سکے۔ ایک اچھی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کو اکثریت حاصل ہے۔ وہ کسی اور جماعت کی حمایت و اشتراک کی محتاج نہیں ہے۔ اسے ‘‘فری ہینڈ’’ ملا ہے اور یہ جمعیت علماء اسلام کے لیے ایک چیلنج اور آزمائش ہے!!

پاکستان قومی اتحاد

اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ۷ جنوری کو قومی اسمبلی میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اس قدر اچانک ہوا کہ ہر کوئی حیران رہ گیا۔ توقع تھی کہ جناب بھٹو مارچ میں انتخابات کا اعلان کریں گے۔ لیکن خفیہ طور پر ملک کی اپوزیشن کی سیاسی جماعتوں کے بارے میں حکومتی ایجنسیاں جو ''ہوم ورک'' کر رہی تھیں ان کی جانب سے گرین سگنل دیا گیا کہ سب خیر ہے۔ اپوزیشن کی جماعتوں میں ایسے اختلافات ہیں کہ یہ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا نہیں ہوسکتیں لیکن سیاسی قائدین کے بھی آپس میں رابطے تھے کہ وزیراعظم بھٹو کے اعلان کے بعد ۴۸ گھنٹوں میں تمام سیاسی جماعتیں اکٹھی ہوگئیں اور یہ خبر بجلی بن کر ایوان اقتدار پر گری۔ اس سے پہلے قومی اتحاد کے قیام کی داستان بیان کی جائے ان حکومتی رپورٹوں کا جائزہ لیا جائے۔ جن کی بنیاد پر جناب بھٹو دھوکہ کھا گئے اور اپنے ہی بنے ہوئے جال میں آ گرے۔ راؤ عبدالرشید خان وزیراعظم کے معاون خصوصی نے مئی ۱۹۷۶ء کو وزیراعظم بھٹو کو ایک رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حزب اختلاف کی پارٹیاں انتخابی اتحاد بنانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہی ہیں لیکن ابھی تک انہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ وہ انتخابات سے قبل ڈھیلا ڈھالا اتحاد قائم کرنے میں شاید کامیاب ہو جائیں۔ تاہم ہماری کوششیں ہونی چاہئیں۔ جیسا کہ وزیراعظم نے کہا ہے کہ اس اتحاد میں رکاوٹیں ڈالی جائیں اور اسے روکا جائے۔ اس حوالے سے راؤ رشید نے لکھا کہ

مندرجہ ذیل لائحہ عمل ترجیحی بنیادوں پر وزیراعظم کے غور کے لیے پیش کیا جائے۔ ایئر مارشل اصغر خان کو حزب اختلاف کی قیادت سنبھالنے سے روکا جائے۔ اس سلسلے

میں ان میں پہلے سے مضبوط مزاحمت موجود ہے۔ نوابزادہ نصر اللہ اور مسلم لیگ میں صاحبزادی محمودہ بیگم جیسے عناصر پر کام کر کے اس مزاحمت کو اور مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ اس پر بھٹو صاحب نے لکھا کہ ''ہاں اسے روکو''

این ڈی پی کو حزب اختلاف کی صف میں شامل ہونے سے روکا جائے۔ یہ کام ان کے علیحدگی پسندانہ منشور پر حملے کر کے کیا جا سکتا ہے۔ مجیب الرحمٰن کے چھ نکاتی پروگرام سے ان کی مماثلت اور صوبوں کی حدود کے تعین اور ان کی ثقافتوں اور زبانوں کی حوصلہ افزائی کے ضمن میں آئین کی بنیادی باتوں کو نئے سرے سے اٹھانے کے متعلق ان کے منصوبے پر کام کیا جا سکتا ہے اگر ان کے منشور کے تفصیلی جائزے کا انتظار کیے بغیر یہ حملہ فوری طور پر شروع کر دیا جائے تو اس سے جمعیت علماء اسلام مسلم لیگ اور عام طور پر پنجاب میں این ڈی پی کو اپنی صفوں میں شامل کرنے میں سخت دقت اٹھانی پڑے گی اس پر بھٹو صاحب نے لکھا کہ ''ان کی یو ڈی ایف میں شمولیت کے کچھ فائدے بھی ہیں۔ اگر تم کر سکو تو انہیں الگ رکھو لیکن پہلی بات دوسری بات سے اہم ہے۔''

مندرجہ ذیل لیڈروں کو غالباً کچھ کوشش سے پیپلز پارٹی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ایم کے خاکوانی صاحبزادی محمودہ بیگم حسن محمود، حنیف رامے، ملک قاسم، جس پر بھٹو صاحب نے لکھا کہ ہاں! کوشش کی جائے''

نومبر ۱۹۷۵ء میں وزیراعظم بھٹو نے انٹیلی جنس بیورو کو ہدایت کی کہ سردار شیر باز مزاری اور مولانا مفتی محمود پر کام کیا جائے اور ان کے اختلافات بڑھائے جائیں تاکہ کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو سکے۔ بیورو کو ہدایت کی گئی کہ وزیراعظم کی ہدایت پر عمل درآمد کیا جائے بھٹو مرحوم کا دور حزب اختلاف کے رہنماؤں کے خلاف جبر و تشدد کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے دور میں نواب محمد احمد خان کے علاوہ جماعت اسلامی کے اس وقت کے قومی اسمبلی کے رکن ڈاکٹر نذیر احمد، تحریک پاکستان کے نامور کارکن خواجہ محمد رفیق، پیر پگاڑو کے ایک خلیفہ فقیر محمد امین، پختون

خواہ نیپ کے لیڈر عبدالصمد اچکزئی، جمعیت علماء اسلام کے رہنما اور بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر مولوی شمس الدین، سندھ یونیورسٹی جام شورو کے پروفیسر اشوک کمار کو حکومتی سرپرستی میں قتل کیا گیا۔ دلائی کیمپ قائم کیا گیا جہاں صوبہ پنجاب کے دو سابق وزراء اور بہت سے کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جو مصطفیٰ کھر کے ساتھی قرار دیے گئے تھے۔ ایک مسلم لیگی لیڈر ملک محمد قاسم کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگی اور وہ ایک مدت بیٹھنے میں تکلیف محسوس کرتے تھے۔ تاہم اس کی ذمہ داری بھٹو مرحوم صوبہ کے گورنر ملک غلام مصطفیٰ کھر پر عائد کرتے تھے۔ اگرچہ مرحوم بھٹو جرأت کے بڑے دعویدار تھے لیکن عملاً ایسا نہیں تھا۔ اگر وہ عام انتخابات میں دھاندلی نہ کرواتے تو ملک مارشل لاء کی گرفت میں نہ آتا۔ مگر وہ اپنی مضبوط کرسی کو ہر صورت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے عام انتخابات کا اعلان کیا تو انہیں راؤ رشید اور ان کے ساتھیوں نے یقین دلایا تھا کہ اپوزیشن کی جماعتیں اکٹھی نہیں ہو سکتیں اور فتح ان کا مقدر بن چکی ہے۔ ۷ جنوری کو انہوں نے قومی اسمبلی توڑنے اور عام انتخابات کا اعلان کیا۔ اس وقت لاہور میں ایئر مارشل اصغر خان کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ ہم پیپلز پارٹی کو شکست دیں گے۔ مولانا مفتی محمود اسلام آباد سے جہلم روانہ ہو چکے تھے جہاں جمعیت کے کارکنوں کے ایک استقبالیہ سے خطاب کرنا تھا۔ پیر صاحب پگاڑو کراچی میں تھے نوابزادہ نصر اللہ خان نے ان سے رابطہ کیا۔ جماعت اسلامی کے پروفیسر عبدالغفور نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ شیر باز مزاری سب سے بات ہوئی اور اپوزیشن کی ۹ بڑی چھوٹی جماعتوں نے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونے کا فیصلہ کیا۔ ۱۰ جنوری کو شمالی لاہور کے علاقہ شاد باغ میں جمعیت علماء پاکستان کے سیکرٹری جنرل جناب رفیق باجوہ کی اقامت گاہ پر شام کو اپوزیشن پارٹیوں کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جو رات گئے تک جاری رہا اور ایک بجے رات ملک کی ۹ جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے ایک نشان ایک جھنڈے تلے متحد ہونے کا فیصلہ کیا۔ جس کا باضابطہ اعلان ۱۱ جنوری کو مسلم لیگ ہاؤس میں کیا گیا۔ مشترکہ پریس کانفرنس مولانا مفتی محمود

ایئر مارشل اصغر خان، نوابزادہ نصر اللہ، پروفیسر عبد الغفور، رفیق باجوہ نے کی۔

رفیق باجوہ کی اقامت گاہ پر جب اجلاس ہو رہا تھا تو اس وقت شدید سردی تو تھی ہی رات بارش بھی شروع ہوگئی۔ رات گیارہ بجے ہم اخبار نویس چائے کی تلاش میں نکلے۔ اس وقت ایسا لگتا تھا کہ اجلاس کسی بڑے اختلاف سے دوچار ہے اور یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ کسی لیڈر کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ چوہدری خادم حسین جو ان دنوں روزنامہ امروز کے رپورٹر تھے ان کی اطلاع تھی کہ مسلم لیگ کے سینئر نائب صدر غلام مصطفیٰ کھر راولپنڈی سے پہنچنے والے ہیں۔ مولانا مفتی محمود کسی سے بات کرنے باہر نکلے تو اخبار نویس انہیں دیکھ کر ان کی جانب دوڑے تو مولانا مرحوم نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔ ہم آپ کو خوشخبری دینے والے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ ہم میں اختلاف ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ہم حکمت عملی کو حتمی شکل دے رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! ہم یہ خبر دے دیں۔ اپوزیشن متحد ہوگئی ہے۔ تو حضرت مفتی صاحب کا جواب تھا ''ہم پہلے ہی متحد تھے۔ بھٹو آمریت کو انشاءاللہ ختم کر دیں گے۔''

پونے ایک بجے کے قریب لیڈروں کی روانگی شروع ہوگئی سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ ایئر مارشل اصغر خان نے مسکراتے ہوئے کہا کہ کل صبح ۱۱ بجے مسلم لیگ ہاؤس میں ملاقات ہوگی۔ جبکہ رفیق باجوہ نے مختصر بریفنگ دیتے ہوئے ''پاکستان قومی اتحاد'' کے قیام کی ''اچھی خبر'' مہیا کی۔ جو ظاہر ہے اگلے روز نوائے وقت کی لیڈ سٹوری اور دوسرے اخباروں میں بھی نمایاں طور پر بڑی خبر تھی۔ کہتے ہیں کہ جب رات گئے جناب بھٹو کو یہ خبر دی گئی تو انہوں نے سعید احمد خان اور راؤ رشید کو طلب کر کے انہیں برا بھلا کہا۔ ان کی رپورٹوں پر برہمی کا اظہار کیا اور ہدایت کی کہ ان کا راستہ روکنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔ وزیراعظم کے معاون خصوصی جناب محمد حیات خان ٹمن سے کہا گیا کہ مؤثر اور بہتر امیدوار تلاش کریں۔ قومی اتحاد کے بڑے بڑے لیڈروں کی فہرست مرتب کی گئی تا کہ انہیں شکست دینے کے لیے کارروائی کی جا سکے۔

ایک طرف بھٹو حکومت اور ان کی تمام سرکاری مشینری تھی دوسری جانب پاکستان قومی

اتحاد مقابلہ بڑا سخت تھا کہ بھٹو مرحوم نے فیڈرل سیکورٹی فورس کے نام سے ایک گسٹاپو کی طرز پر باقاعدہ ''نجی فوج'' بھی بنا رکھی تھی- پاکستان قومی اتحاد نے مولانا مفتی محمود کو متفقہ طور پر صدر منتخب کیا- جناب رفیق باجوہ پہلے سیکرٹری جنرل تھے- یہ ایک نامور وکیل اور بہت اچھے مقرر تھے- اس وقت عوام بڑے جذباتی انداز میں قومی اتحاد کے ساتھ تھے- جناب باجوہ صاحب سے ایک ذرا سی غلطی ہوئی کہ وہ اس عوامی سیل میں بہہ گئے- ہوا یہ کہ انٹیلی جنس بیورو نے جناب باجوہ کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ وزیراعظم بھٹو سے ملاقات کریں- بھٹو صاحب ان سے انتخابات کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا چاہتے ہیں- اس وقت پنجاب میں ایک ریٹائرڈ بریگیڈیر چیف سیکرٹری تھے- چنانچہ پی آئی اے کی ایک پرواز سے انہیں اسلام آباد لے جایا گیا- جہاں وزیراعظم سیکرٹریٹ کے سعید افضل خان نے ان کا استقبال کیا- ان دنوں پی آئی اے کی یونین جماعت اسلامی کی حامی پیاسی ہوا کرتی تھیں انہیں شک ہوا- انہوں نے جناب باجوہ کا پیچھا کیا اور لمحہ لمحہ تمام کارروائی سے جماعت اسلامی کو مطلع رکھا- جب یہ بات سامنے آئی تو نہ صرف قومی اتحاد کی سیکرٹری جنرل شپ سے وہ فارغ ہوئے بلکہ جمعیت پاکستان نے بھی انہیں پارٹی سے نکال دیا- جناب باجوہ نے اس کی تردید کی لیکن بھٹو مرحوم بڑے کمال کے لیڈر تھے کہ کچھ عرصہ بعد لاہور ائیرپورٹ پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے اس ملاقات کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ نوجوان اگر مجھے ملنے آ گیا تو کیا غلطی تھی کہ اسے قومی اتحاد سے سزا کے طور پر نکال دیا- سیاسی لوگ آپس میں ملتے رہتے ہیں-

رفیق باجوہ کے بعد یہ عہدہ پروفیسر غفور کو دیا گیا اور یہ آخر وقت تک پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل رہے- جبکہ صدارت و قیادت مولانا مفتی محمود نے کی- ان کی قیادت میں ووٹ کے تقدس جمہوریت کی بحالی اور نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے جو عوامی تحریک چلائی گئی- اس کی پوری تاریخ میں مثال نہیں ملتی- ایک دو نہیں سینکڑوں کارکن شہید ہوئے- ہزاروں گرفتار کیے گئے- قائدین کے ساتھ قید کے دوران تشدد کیا گیا- پیر صاحب پگاڑو کو بھی اسلام آباد میں

حراست میں لیا گیا۔ جس پر سانگھڑ میں حروں نے بغاوت کر دی اور بھٹو مرحوم نے گھبرا کر نہ صرف انہیں رہا کر دیا۔ بلکہ ان سے ملنے پرل کانٹینل ہوٹل جا پہنچے تا کہ ٹیلی ویژن پر اس کی فلم دکھا کر حروں کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ ان کے روحانی پیشوا قید میں نہیں ہیں۔ میجر محمد افضل کنونشن لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ بعد میں سید حسن محمود کے مینجر اور معاون خصوصی بن گئے۔ جب پیر صاحب پگاڑو لاہور آتے تو ان کی دیکھ بھال میجر صاحب کی ذمہ داری ہوتی۔

پاکستان قومی اتحاد نے لانگ مارچ کا اعلان کیا۔ حکومت نے اسلام آباد جانے والے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیے۔ ہزاروں کارکن گرفتار کر لیے گئے جبکہ پیر صاحب پگاڑو تمام ناکے توڑتے ہوئے اسلام آباد پہنچ گئے۔ میجر افضل ان کے ہمراہ تھے۔ مرحوم بتاتے ہیں کہ پیر صاحب پگاڑو خود گاڑی چلا رہے تھے ایک دو جگہ پولیس نے روکنے کا اشارہ کیا لیکن پیر صاحب نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ مرحوم میجر صاحب اسے جناب پیر صاحب کی کرامت بھی قرار دیا کرتے تھے۔ پولیس انہیں پہچان نہ سکی۔ میجر صاحب نے بتایا جب پیر صاحب ہوٹل پہنچے تو چند منٹ بعد چند سول اور پولیس حکام ان کے کمرے میں آئے اور انہیں اطلاع دی کہ ''وہ اپنے کمرے میں نظر بند ہیں' باہر نہیں جا سکتے۔'' پیر صاحب پگاڑو نے اس مہمان نوازی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ ابھی پیر صاحب نہا دھو کر تیار ہی ہوئے تھے کہ بھاگ دوڑ شروع ہو گئی اور بھٹو صاحب وہاں آ پہنچے اور انہوں نے پیر صاحب پگاڑو سے کہا کہ یہ انتظام آپ سے ملاقات کے لیے کیا گیا تھا۔ آپ کو کسی نے نظر بند نہیں کیا۔ اس پر پیر صاحب پگاڑو نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ ملاقات کرنے کا یہ سرکاری طریقہ خوب ہے۔

پاکستان قومی اتحاد اور بھٹو حکومت کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے نہ صرف قومی سطح بلکہ غیر ملکی سطح پر کوششیں کی گئیں۔ سعودی عرب، کویت، قطر اور فلسطین کے سربراہوں نے براہ راست بھٹو حکومت اور قومی اتحاد کے قائدین سے رابطے کیے اور آپس کے اختلافات کو پر امن طور پر حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پاکستان میں ملیشیا کے سفیر بھی سرگرم رہے۔ اسلامی دنیا

کی تنظیم رابطہ عالم اسلامی اور مرتمر عالم اسلامی نے پاکستان کی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا اور نہ صرف مرحوم بھٹو بلکہ مولانا مفتی محمود نوابزادہ نصراللہ اور جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل احمد سے ان کے عہدیداروں نے رابطے کیے اور ایک دوسرے سے پیغام رسانی بھی کی کہ بھٹو حکومت کے خلاف تحریک کو کچلنے کے لیے حکمران نے جو ظلم جبر و تشدد کیا سب اس کے خلاف تھے اور چاہتے تھے اس سے پہلے کہ حکومت اور عوام کا ایک خونریز ٹکراؤ ہو آپس میں ان کے مذاکرات ہوں اور معاملات پرامن طور پر طے ہو جائیں۔ وہ وقت تھا کہ جب قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود اور ان کے ساتھی سہالہ ریسٹ ہاؤس میں قید تھے۔ تحریک نظام مصطفیٰ نے وقت کے آمر کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت کے وزیراعظم بھٹو کسی سیکورٹی اور لاؤلشکر کے بغیر خود گاڑی چلاتے ہوئے سہالہ ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے اور مولانا مفتی محمود نوابزادہ نصراللہ سے ملاقات کر کے انہیں مذاکرات کی دعوت دی اور قومی اتحاد کی جانب سے جو مطالبات رکھے تھے ان پر تبادلہ خیال کیا۔

ان دنوں پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب ہوا کرتے تھے- ان کے بھٹو مرحوم سے گہرے مراسم تھے- انہوں نے خصوصی طور پر اپوزیشن لیڈروں اور حکومت کے درمیان مصالحتی کوششیں کیں- سردار عبدالقیوم کو رہا کر کے آگے لایا گیا- ایک بات قابل ذکر ہے کہ دوست اسلامی ممالک نے بھی اپوزیشن اور حکومت کے درمیان ڈیڈلاک کو توڑنے کی کوششیں کیں- کہا جاتا ہے کہ خادم حرمین شریفین شاہ خالد کو جناب ریاض الخطیب نے مصالحت کرانے کے لیے مجبور کیا تھا- کویت کے وزیر خارجہ جناب شیخ الصباح االاحمد الجبار نے قومی اتحاد کے قائم مقام سربراہ پیر صاحب پگاڑو سے ۱۶ مئی کو اسلام آباد ریسٹ ہاؤس میں ملاقات کی اور ان کے ساتھ مولانا مفتی محمود سے ملنے سہالہ ریسٹ ہاؤس گئے- جہاں نوابزادہ نصراللہ خان بھی نظر بند تھے- کویت کے وزیر خارجہ امیر کویت شیخ الصباح االاحمد الجبار کا حکومت اور اپوزیشن کے نام خصوصی پیغام لے کر آئے تھے-

وزیراعظم بھٹو نے ایک نئی چال کھیلنے کی ناکام کوشش کی اور وہ یہ تھی کہ ملک میں ریفرنڈم کرایا جائے۔ اس سلسلہ میں آئین میں ساتویں ترمیم کی گئی۔ لیکن عوامی ردعمل اور بیرونی دوستوں کے دباؤ کی وجہ سے بھٹو مرحوم کو مولانا مفتی محمود کے پاس خود چل کر سہالہ جانا پڑا۔ ۱۱ مئی رات کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں مولانا مفتی محمود اور پیر صاحب پگاڑو سے بات چیت کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے انہیں بتایا کہ بھارت اور ایران کی افواج کی نقل وحرکت کے بعد اس وقت قومی اسمبلی کے دوبارہ انتخابات نہیں ہوسکتے۔ وہ اپنے ساتھ ایک حساس محکمے کے اعلیٰ فوجی افسر کو بھی لے گئے تھے۔ جس نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ مولانا مفتی محمود نے ان سے کہا کہ اگر ان کی بات درست ہے تو ایسی صورت میں فوری طور پر منتخب عوامی حکومت ضروری ہے اور اگلے روز مولانا مفتی محمود نے وزیراعظم بھٹو کو جو مراسلہ بھیجا اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ اگر قومی اسمبلی کے انتخابات دوبارہ نہ ہوئے تو پھر تجاویز اور تبادلہ خیال بے معنی ہے۔ ۱۹ مئی کو سردار عبدالقیوم کو رہا کیا گیا تاکہ مذاکرات کے لیے پیش رفت کی جاسکے۔ اس وقت ملک میں صورت حال یہ تھی کہ انتظامیہ نے پورے ملک میں جبر وتشدد کا ایک نیا دور شروع کررکھا تھا۔ ''اسلامی جمہوریہ'' اور ''چٹان'' بند کردیئے گئے۔ قومی اخبارات کے اشتہارات بند کر کے ان کا دم گھونٹا جارہا تھا۔ سہالہ سے قومی اتحاد کے لیڈروں کو مختلف جیلوں میں منتقل کیا گیا۔ مولانا مفتی محمود کے مطابق تحریک کے دوران گرفتار ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔

۲۰ مئی کو سعودی عرب کے فرمانروا شاہ خالد کی جانب سے بھٹو مرحوم اور مولانا مفتی محمود مرحوم کے نام الگ الگ پیغام آئے۔ ادھر سیالکوٹ میں کرفیو نافذ کردیا گیا۔ ہر بڑے چھوٹے شہر میں ردعمل بڑھتا جارہا تھا۔ پریس پر شدید سنسرشپ عائد تھی۔ لیکن ایسا کرنے سے حالات تو تبدیل نہیں ہوتے۔ ایسا کرنے سے صرف پردہ ڈالا جاسکتا تھا۔ جو حکمرانوں کے لیے بھی ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے اور مرحوم بھٹو کے لیے بھی ایسا ہی ہوا۔ سردار عبدالقیوم دوسرے رہنماؤں سے

ملاقاتیں کر رہے تھے جبکہ جناب ریاض الخطیب سہالہ میں مولانا مفتی محمود نوابزادہ نصراللہ خان پیرصاحب پگاڑو اور وزیراعظم بھٹو سے کئی بار ملاقاتیں کر چکے تھے- اس دوران فلسطینی رہنما یاسر عرفات کے ایلچی جناب بانی الحسن بھی اسلام آباد پہنچ گئے- انہوں نے سعودی عرب اور چین کے سفیروں سے بھی ملاقات کی- بھٹو صاحب اور مولانا مفتی محمود سے ملے- مولانا مفتی محمود کے نام یاسر عرفات نے اپنے پیغام میں کہا تھا ”ہم کسی فریق کی حمایت نہیں کرتے ہمیں صرف پاکستان اور اس کے عوام کی بہبود سے دلچسپی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کا موجودہ بحران پرامن طور پر حل ہو-

جناب بھٹو پاکستان قومی اتحاد کی بے مثال تحریک کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے- اگرچہ انہوں نے حکومتی طور پر اس تحریک کو سرد کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا- شاید پوری دنیا کی یہ پہلی تحریک ہے جس میں ایک لاکھ کارکن گرفتار کیے گئے- شہید ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے- مولانا مفتی محمود کا کہنا تھا کہ ایک ہزار افراد شہید ہوئے ہیں- ۱۹ اپریل کو صرف لاہور میں ۸۰ سے زائد افراد مارے گئے تھے- مرحوم بھٹو کی انتظامیہ نے تو حد کر دی تھی کہ پیشہ ور عورتوں کی ”نتھ فورس“ بنائی گئی- جس نے خواتین کے جلوس پر تشدد کیا- قومی اتحاد کا سب سے اہم مطالبہ وزیراعظم کا استعفیٰ تھا- پیپلز پارٹی کی حکومت اس مطالبہ کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی اور سعودی عرب کے سفیر کو اس لیے بھٹو صاحب نے آگے کیا تاکہ اس مطالبہ سے نجات حاصل کی جا سکے- اگرچہ یہ کہا گیا کہ سعودی فرمانروا کی ایما پر وہ سب کچھ کر رہے تھے لیکن بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ جناب ریاض الخطیب اور جناب بھٹو ممبئی میں اکٹھے پڑھتے تھے اور یہ بات بھی کہ بھٹو صاحب کے کہنے پر انہیں سفیر بنایا گیا تھا۔ اس لیے وہ بڑے سرگرم تھے اور بالآخر قومی اتحاد اور حکومت کے درمیان عبوری حکومت اور دوبارہ انتخابات پر اتفاق ہوگیا۔ قومی اتحاد کی قیادت رہا کر دی گئی اور ۳۔ جون کو قومی اتحاد اور حکومت کے درمیان باضابطہ مذاکرات کا آغاز ہوا۔ حکومت کی جانب سے بھٹو صاحب حفیظ

پیرزادہ مولانا کوثر نیازی قومی اتحاد کی طرف سے مولانا مفتی محمودؒ، نوابزادہ نصراللہ اور پروفیسر عبدالغفور نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ مذاکرات انتہائی اہم تھے۔ ساری قوم کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ قوم نے پہلی بار ملک میں جمہوریت اور نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ نوابزادہ نصراللہ خان کا کہنا تھا یہ صورت درست ہے کہ ایسی عوامی تحریک کی جمہوری دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ اس سے قبل ایوب دور میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے صدارتی انتخاب میں حصہ لے کر ''شمع جمہوریت'' روشن کی تھی۔ اگرچہ وہ انتخاب ایک ''الیکٹول کالج'' بنا کر کیا گیا تھا اور صرف بنیادی جمہوریت کے ارکان ہی صدارتی انتخاب کے ووٹر تھے لیکن ساری قوم مادر ملت کی آواز پر سڑکوں پر آ گئی تھی۔ بھٹو دور میں بھی ایسا ہی ہوا۔ قومی اسمبلی کے انتخاب میں دھاندلی کی گئی تو قومی اتحاد کی اپیل پر عوام نے صوبائی اسمبلیوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جس پر بھٹو حکومت کو مذاکرات کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان مذاکرات کے آٹھ دور ہوئے۔ آخری دور ۱۵ جون کو ہوا اور تمام امور طے پا گئے۔ کہتے ہیں کہ مذاکرات کامیاب ہو گئے تھے اور یہ طے پایا کہ دونوں کے قانونی ماہرین اسے حتمی شکل دیں گے جبکہ وزیراعظم لیبیا، متحدہ عرب امارت کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔ پروفیسر غفور اور مولانا کوثر نیازی نے اس بارے میں کتابیں لکھی ہیں۔ سب کہتے ہیں کہ آپس میں سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مارشل لاء لگا دیا۔ وزیراعظم بھٹو کو اپنے آپ پر ہی نہیں ساتھیوں خصوصاً جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں پر مکمل اعتماد تھا۔ تینوں فوجی سربراہ اور چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے سربراہ نے ایک مشترکہ بیان میں آئینی حکومت سے وفاداری کا اعلان بھی کیا۔ راؤ رشید نے مجھے یہ واقعہ سنایا۔ ۳ جولائی کی بات ہے ایک اہم اجلاس کے بعد وزیراعظم بھٹو کانفرنس ہال سے نکل کر وزیراعظم ہاؤس کے دوسرے حصے میں جا رہے تھے۔ بھٹو صاحب کے ساتھ ملک غلام مصطفیٰ کھر تھے۔ راؤ رشید جنرل ٹکا خان تھے جبکہ پیچھے جنرل ضیاء الحق، افضل سعید خان اور دوسرے سٹاف کے ارکان تھے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر معافی حاصل کر کے

وزیراعظم کے معاون خصوصی بن چکے تھے- انہوں نے وزیراعظم بھٹو کو مخاطب کر کے کہا کہ صاحب مجھے وجہ تو نہیں معلوم لیکن ہم زمیندار لوگ اندازہ لگا لیتے ہیں- مجھے آپ کے کمانڈر کی آنکھ میں سور کا بال نظر آتا ہے- بھٹو صاحب نے اپنے سیکورٹی چیف جنرل ٹکا خان کی طرف دیکھا اور کہا کہ ''ٹکا! مستی کیا کہتا ہے''

جنرل ٹکا خان نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ سر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جنرل ضیاء آپ کا وفادار ہے یہ آپ پر اپنے بچے قربان کر دے گا-''

جناب بھٹو نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جنرل ضیاء بڑے باادب تھے اور بھٹو صاحب مسکرا کر اندر چلے گئے- یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں نے ''ہوم ورک'' مکمل کر لیا تھا- ان کے چند سیاست دانوں سے رابطے بھی تھے- ریٹائر ائیر مارشل اصغر خان نے فوج کے نام کھلا خط لکھا جس میں انہیں مداخلت کی دعوت دی گئی تھی- یہ خط بیگم اصغر خان ۲ مئی کو سہالہ ریسٹ ہاؤ سے لے کر آئیں اور اس روز بی بی سی کے نمائندہ مارک ٹیلی کو پہنچایا- مارک ٹیلی نے بی بی سی پر تحریک نظام مصطفیٰ کی خبروں کی بڑی کوریج کی تھی کہ بھٹو صاحب مرحوم نے ایک بار انہیں قومی اتحاد کا دسواں ستارہ قرار دیا-

بارک اللہ خان قومی اتحاد کے شعبہ اطلاعات کے ذمہ دار تھے اور تحریک کے دنوں میں بڑے متحرک تھے- مرحوم بارک اللہ خان قومی اتحاد کی ہر خبر سے (مارک ٹیلی کو) مطلع کرتے اور وہ خبر تھوڑی دیر میں ہی بی بی سی سے نشر ہو جاتی- ائیر مارشل اصغر خان یہ خط مسلح افواج کے سربراہوں اور اعلیٰ افسروں تک پہنچنے سے پہلے بی بی سی اور اسٹریلیا ریڈیو سے نشر کیا گیا- ۳ مئی کو وائس آف امریکہ نے نشر کیا جبکہ ۳ مئی اور ۴ مئی کی درمیانی شب یہ افواج کے سربراہوں اور فوجی افسروں کو ارسال کیا گیا- قومی اسمبلی میں جنرل ٹکا خان نے بتایا کہ انٹیلی جنس نے یہ خط اعلیٰ فوجی افسروں میں سے ایک سے حاصل کر کے مجھے اور وزیراعظم کو دیا- یہ خط انگریزی میں لکھا گیا- بعد میں ترجمہ کر کے مساجد میں تقسیم کیا گیا- جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے نفاذ

کے بعد لاہور میں چند اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے یہ انکشاف کیا تھا کہ این ڈی پی کے لیڈروں نے بھی فوج سے رابطہ کیا تھا اور انہیں حیدر آباد ٹربیونل توڑنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی-

چوہدری ارشد نے بعد میں اس کی تصدیق بھی کی تھی- واقعہ حضرت مفتی محمود نے کچھ یوں بیان فرمایا تھا کہ مذاکرات کے بعد آخری دنوں میں وہ اسلام آباد میں ارشد چوہدری کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے- شام کا وقت تھا کہ بیگم نسیم وہاں تشریف لائیں اور مفتی صاحب سے کہا کہ ہم آپ سے الگ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں- حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ ٹھیک ہے اور اٹھ کر الگ جانے لگے تو بیگم صاحبہ نے کہا کہ باہر چلیں- باہر نکلے تو سردار شیر باز مزاری کار میں بیٹھے تھے- قبلہ مفتی صاحب کار میں بیٹھ گئے- کچھ دور جا کر کار کھڑی کر لی اور بیگم نسیم ولی خان نے مفتی صاحب کو اطلاع دی کہ ہمارا فوجیوں سے رابطہ ہوا ہے- وہ حیدر آباد ٹربیونل توڑنے پر تیار ہو گئے ہیں- مولانا مفتی محمود نے انا للہ پڑھی اور کہا کہ اگر ایسا ہے تو پھر میں واپس ڈیرہ اسماعیل خان چلا جاتا ہوں- مرحوم بھٹو نے تاخیری حربے اختیار کیے- وہ معاہدہ کرنا چاہتے تھے مگر مخلص نہیں تھے- ملک غلام مصطفیٰ کھر جو آخری دنوں میں یہ کہہ کر بھٹو صاحب سے واپس آ ملے تھے کہ اگر میں بھٹو کی پیش کش قبول نہیں کروں گا تو ولائی کیمپ میں میرے ساتھیوں کو نقصان ہو سکتا ہے- ملک صاحب کو یقین تھا کہ وہ ایف ایس ایف کے ذریعہ تحریک کو ختم کر دیں گے- یہی وہ حالات تھے جنہوں نے فوج کو حکمران بننے کا موقع فراہم کیا- اس طرح عوام کی عظیم تحریک جمہوریت بحال کرانے کے بجائے مارشل لاء کا شکار ہو گئی اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت اور وزیراعظم بھٹو پر عائد ہوتی ہے کہ مذاکرات کامیاب ہونے کے باوجود حکومت نے معاہدہ پر دستخط نہیں کیے۔ قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے حفیظ پیرزادہ صاحب اور مولانا کوثر نیازی سے رابطے کیے کہ معاہدہ کو حتمی شکل دے کر اس کا اعلان کر دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

دھوکا ہو گیا

مولانا مفتی محمود کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ مرحوم صدر ضیاءالحق نے اسلامی نظام کے نفاذ کا وعدہ کر کے پاکستان قومی اتحاد کی قیادت کو دھوکہ دیا ہے اور وہ بھی اس کے ذمہ داروں میں شامل ہیں۔ مولانا مفتی محمود مرحوم کو ذیابیطس کی شکایت تھی اور اس بیماری میں چینی کا استعمال نقصان دیتا ہے۔ لوئر مال میں غلام دستگیر صاحب ان کے ایک عقیدت مند تھے جن کی اقامت گاہ پر مولانا مفتی محمود اکثر قیام فرمایا کرتے تھے اور غلام دستگیر ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ ضیاءالحق نے برسر اقتدار آتے ہی نہ صرف قومی اتحاد بلکہ عوام سے یہ عہد کیا تھا کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا۔ یہی وہ وعدہ تھا جس پر قومی اتحاد مارشل لا حکومت میں شریک اقتدار ہوئی تھی۔ تاہم تحریک استقلال اور جمعیت علماء پاکستان نے وزارت میں اپنے نمائندے نامزد نہیں کیے تھے اور یہ کہ ضیاءالحق مرحوم نے وعدہ کے باوجود صوبہ کی سطح پر قومی اتحاد کو شامل اقتدار نہیں کیا۔ اس پر آپس میں مذاکرات ہوئے۔ ملاقاتیں ہوئیں اور بالآخر مصنوعی شراکت ٹوٹ گئی۔ قومی اتحاد کے وزیر واپس آ گئے۔ مسلم لیگ میں ایک دھڑا بنا تو چوہدری ظہور الٰہی، زاہد سرفراز وزیر بن گئے۔ پیر صاحب پگاڑو اس کے خلاف تھے۔ بلکہ بعد میں خواجہ صفدر اور ان کے ساتھیوں سے ناراض بھی ہوئے۔ لیکن ایک سرکاری مسلم لیگ بن گئی۔ پیر صاحب پگاڑو نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”مسلم لیگ مفاد پرستوں کی پارٹی ہے۔ میری جیبیں خالی ہیں۔ میرے پاس انہیں دینے

کے لیے کچھ نہیں ہے۔ '' تو بات حضرت مولانا مفتی محمود کی ہو رہی تھی کہ یہ ۷۹ء کی بات ہے۔ قومی اتحاد حکومت سے الگ ہو چکا تھا۔ مولانا مفتی محمود غلام دستگیر کی رہائش گاہ پر مقیم تھے۔ دوپہر کا وقت تھا میں نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت مولانا تنہا فرش پر تشریف فرما تھے اور ایک تھالی میں سے کشمش کھا رہے تھے۔ میں نے عرض کی کہ حضرت آپ کو شوگر کی تکلیف ہے آپ کشمش کھا رہے ہیں۔ مولانا مفتی محمود نے میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ مغموم ہیں ایک کرب ان کے چہرے پر نمایاں تھا۔ درد بھرے لہجہ میں مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ ''بیٹے انور! ضیاء الحق بڑا مکار شخص ہے اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ تحریک نظام مصطفیٰ کے شہداء کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے اور میں اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ تحریک نظام مصطفیٰ میں سینکڑوں کارکن شہید ہوئے ہیں۔ ہزاروں گرفتار اور زخمی ہوئے۔ انہوں نے ایک عظیم مقصد کے لیے قربانیاں دیں۔ وہ عظیم لوگ تھے لیکن جنرل ضیاء الحق نے ہمیں ٹریپ کر لیا۔ وعدہ کیا کہ تحریک کے مقاصد پورے کیے جائیں گے۔ ۹۰ء دن میں عام انتخابات ہوں گے۔ لیکن یہ سب سراب ثابت ہوا۔ کیا ان لوگوں نے اس لیے جانیں دی تھیں۔ اس لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ میرے دل و دماغ پر اس کا شدید بوجھ ہے۔ بیٹا! مجھے رات کو نیند نہیں آتی مجھے یہ احساس سونے نہیں دیتا کہ اتنے جوان شہید ہوئے۔ ماؤں سے ان کے بیٹے بچھڑ گئے۔ بہنوں کے بھائی جدا ہوئے۔ سب کچھ کس لیے تھا۔ کیا صرف اس لیے کہ مارشل لاء لگے اور ہمیں وزارتیں مل جائیں۔ یا یہ تحریک صرف بھٹو صاحب کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے تھی۔ اگر یہ درست ہے تو ہم سب ان کی شہادتوں کے ذمہ دار ہیں اور ہمیں اس کا جواب دینا ہوگا۔ میں سوچتا ہوں کہ اللہ کے حضور یوم حشر میں کیا جواب دوں گا۔ جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ مفتی محمود تمہاری قیادت میں اتنے لوگ شہید ہوئے۔ زخمی ہوئے، میں نے محسوس کیا کہ حضرت مولانا مفتی محمود کو اس بات کا گہرا دکھ اور صدمہ تھا کہ پاکستان قومی اتحاد نے جس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے تحریک چلائی تھی وہ تو پورا نہیں ہوا بلکہ

ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے- مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب حضرت مولانا مفتی محمود یہ کہہ رہے تھے تو ان کی آواز بھرا گئی تھی اور ان کی آنکھیں نمناک تھیں- وہ اس وقت کے صدر ضیاء الحق سے نہ صرف بہت ناراض تھے بلکہ ان کے شدید مخالف تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ شخص اسلام کا نام اپنے اقتدار کو بچانے اور طول دینے کے لیے لیتا ہے- جبکہ یہ اسلام نافذ کرنے میں کسی طور پر مخلص نہیں ہے-

اور آخر میں یہ تین لطیفے جو حکومت اور قومی اتحاد کے مذاکرات کے دوران ہوئے:

ہاتھ دو:

ذوالفقار علی بھٹو نے مذاکرات کے دوران مولانا مفتی محمود سے مخاطب ہو کر کہا کہ مولانا ہم تو آپ کی ہر بات تسلیم کرتے ہیں- آپ کا ہر مطالبہ مان رہے ہیں لیکن اس کے بدلے آپ کچھ نہیں دے رہے- مولانا مفتی محمود کا جواب تھا کہ ہم مولوی لوگ ہیں صرف لینا جانتے ہیں- اس کے بعد یہ لطیفہ سنایا کہ ایک مولوی دریا میں ڈوب رہا تھا- لوگ اکٹھے ہو گئے- مولوی دریا میں ہاتھ پیر مار رہا ہے- ایک شخص آگے بڑھا اور آواز دی مولوی صاحب ہاتھ دینا- مولوی صاحب نے سنا تو ایک غوطہ اور لگایا- اس پر لوگوں نے نے کہا کہ میاں کیا کر رہے ہو، جانتے نہیں یہ مولوی صاحب ہیں انہیں کہو کہ ذرا ہاتھ لینا- پھر ہاتھ پکڑیں گے- چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر آواز دی مولوی صاحب ذرا ہاتھ لینا- اس پر ڈوبتے ہوئے مولوی صاحب نے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور پکڑنے والے کا ہاتھ تھام لیا- تو بابا ہم مولوی لوگ، کچھ دینا نہیں جانتے-

ذیابیطس کی وجہ:

ایک موقع پر جناب بھٹو نے مفتی صاحب مرحوم سے ان کی بیماری ذیابیطس کے بارے میں پوچھا تو مولانا مرحوم نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ اب کنٹرول میں ہے- بھٹو صاحب نے

اس مرض کی وجہ پوچھی تو مولانا مرحوم بولے بعض اوقات ذہنی الجھن سے اس مرض میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ بھٹو نے کہا کہ آپ کی ذہنی الجھن کیا ہے؟

مفتی صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ ''آپ''

مذاکرات کے دوران ایک موقع پر بھٹو صاحب نے ۹ جماعتی اتحاد کے قیام اور برقرار رہنے پر تعجب کا اظہار کیا کہ نو جماعتیں کیسے متحد ہو گئیں اور اب تک یہ اتحاد کیسے برقرار ہے؟ اس پر مفتی صاحب نے کہا کہ آپ کی وجہ سے یہ قائم ہوا اور آپ ہی کی وجہ سے برقرار ہے۔ نوابزادہ صاحب بولے کہ اگر ہمارا انتشار دیکھنے کا شوق ہے تو جناب تشریف لے جائیں شوق پورا ہو جائے گا۔

مسکراہٹ کی فرمائش:

۳ جون ۱۹۷۷ء کو جب حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا تو بھٹو صاحب کی یہ خواہش تھی کہ قومی اتحاد کے قائدین مسکرائیں۔ اجلاس کے بعد جب فوٹوگرافروں نے تصویر اتارنا شروع کی تو بھٹو صاحب نے نوابزادہ صاحب اور مولانا مفتی مرحوم سے کہا کہ جناب ذرا سا مسکرائیں۔

مولانا مفتی محمود نے تاریخی جملہ کہا کہ ''آپ مسکرانے دیں تو مسکرائیں''

جناب بھٹو، مولانا مفتی محمود آمنے سامنے

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مولانا مفتی محمود سیاسی میدان میں ذوالفقار علی بھٹو کا مسلسل پیچھا کرتے رہے اور انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں بھٹو صاحب کی مقبولیت کا سورج عروج پر تھا۔ عوام نے انہیں ''من مندر'' میں بسا رکھا تھا کہ عام انتخابات میں جس کے گلے میں پیپلز پارٹی کا ترنگا لٹک رہا تھا وہ کامیاب ہو گیا۔ بڑے بڑے سیاسی بت ٹوٹ گئے۔ ایسے لوگ منتخب ہوئے جنہیں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ایک کامیاب امیدوار کے بارے میں جب اس کے حلقہ کے لوگوں سے پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا کہ امیدوار کو تو ہم نہیں جانتے۔ ہم نے تو بھٹو کو ووٹ دیے ہیں۔ بھٹو صاحب کا روٹی، کپڑا، مکان کا نعرہ گلی گلی گونجا۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب جب انتخابات میں ہوا کے گھوڑے پر سوار سرپٹ دوڑ رہے تھے اور ایک نہیں چار حلقوں سے امیدوار تھے تو ڈیرہ اسماعیل خان میں مولانا مفتی محمود نے انہیں چاروں خانے چت کر دیا۔

مولانا مفتی محمود بھٹو صاحب کی اس شکست کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں نے اس وقت بھٹو صاحب کو شکست دی جب قوم ان کے سحر میں تھی۔ اب تو یہ دو رکعت کی مار نہیں ہیں۔ عام انتخابات میں سندھ و پنجاب میں پیپلز پارٹی اکثریت میں تھی جبکہ سرحد و بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کو اکثریت حاصل تھی۔ بھٹو پارٹی نے ان دونوں صوبوں میں ووٹ توڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ چنانچہ

جب آئین بن گیا اور صوبوں میں حکومتیں بنائی گئیں تو سرحد اسمبلی نے مولانا مفتی محمود کو قائد ایوان منتخب کیا- بلوچستان میں سردار عطاء اللہ خان مینگل وزیراعلیٰ بنائے گئے- اگرچہ بھٹو صاحب نہیں چاہتے تھے کہ کوئی عالم دین خصوصاً وہ شخص جس نے انہیں شکست دی ہو وزیراعلیٰ بنے- لیکن مولانا مفتی محمود وزیراعلیٰ بن کر بھٹو صاحب کے مدمقابل آ گئے اور یہ تاریخ کا جبر ہے کہ پاکستان کے معاملات میں دوستی کے نام پر مداخلت کی گئی ہے- صوبہ بلوچستان میں میر غوث بخش گورنر اور جناب مینگل وزیراعلیٰ تھے یہ بات درست ہے کہ وزیراعلیٰ وزیراعظم بھٹو کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ان کے غلط احکامات پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا تھا- لیکن دوسری طرف ایران کے شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کو بلوچستان کے حکمران پسند نہیں تھے- بھٹو صاحب گورنر بزنجو کو لے کر تہران گئے تاکہ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کو جو خدشات، شکایات ہیں ان کا ازالہ کیا جا سکے- رضا شاہ پہلوی کی بہن شہزادی اشرف پہلوی نے کوئٹہ میں جلسہ عام سے خطاب بھی کیا- لیکن انہیں مطمئن نہیں کیا جا سکا- یہ وہ دور تھا جب اس خطہ میں شہنشاہ ایران امریکہ کا ''مانیٹر'' تھا اور وہ اس خطہ کو اپنی ایمپائر کہا کرتے تھے- سوئٹزر لینڈ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اس بادشاہ نے بڑے تکبر سے یہ کہا تھا کہ تہران سے جکارتہ تک مری ایمپائر ہے- بعد میں چشم فلک نے دیکھا کہ اس شخص کو قبر کے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی- امریکہ جو اس کا سرپرست تھا اس نے آنکھیں پھیر لیں- قاہرہ میں وہ دنیا سے رخصت ہو گیا- بلوچستان کی حکومت ختم کرنے کے لیے بھٹو حکومت نے ہر غیر جمہوری، غیر قانونی ہتھکنڈہ اختیار کیا اور جبراً عطاء اللہ مینگل کو برطرف کر کے مڑے ہی تھے کہ مولانا مفتی محمود نے وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے کر ملک کو ایک نہ ختم ہونے والے سیاسی بحران سے دوچار کر دیا- اگرچہ اس کے بعد چھ سال بھٹو حکمران رہے لیکن امن و چین سے حکومت نہ کر سکے- مولانا مفتی محمود ان کا مسلسل پیچھا کرتے رہے- انہیں قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کا لیڈر منتخب کیا گیا اور یہاں بھی ان کا بھٹو صاحب سے آمنا سامنا رہا- ان کی نشست قائد ایوان کے مدمقابل تھی اور ایسی

بھرپور اپوزیشن کی پارلیمان تاریخ کا روشن باب بن گئی- وزیراعظم بھٹو نے ۱۲ نومبر ۱۹۷۵ء کو قومی اسمبلی میں آئین میں چوتھی ترمیم منظور کرنے کی کوشش کی تو مولانا مفتی محمود ان کے مدمقابل آ گئے اور ایوان میں ایسا ہنگامہ کیا جس کی پارلیمانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی- حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے ارکان آپس میں گتھم گتھا ہو گئے- مولانا مفتی محمود صدائے حق بلند کرتے ہوئے زخمی ہو گئے- چوہدری ظہور الٰہی، ذوالفقار باجوہ سب زخمی ہوئے اور سارجنٹ ایٹ آرمز کے ذریعہ اپوزیشن کو جبراً ایوان سے باہر نکال دیا گیا- یہ بھی پہلی بار ہوا کہ اسمبلی کے دروازے مقفل کر دیے گئے- تا کہ اپوزیشن والے دوبارہ ایوان میں واپس آ کر ہنگامہ نہ کریں- اس طرح یک طرفہ طور پر بھٹو صاحب نے ایک اور ترمیم منظور کروالی- اس واقعہ پر ملک میں شدید غم وغصہ کا اظہار کیا گیا اور حضرت مفتی صاحب کی جرأت کو خراج تحسین پیش کیا گیا- مولانا مفتی محمود ایک بڑی دینی جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے پہلے ہی قومی قیادت میں شمار ہوتے تھے- لیکن قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد کی حیثیت سے ان کے کردار نے انہیں صف اول کا قائد بنا دیا اور اس حیثیت سے وہ قومی اسمبلی کے اندر اور باہر جناب بھٹو کا پیچھا کرتے رہے- ان کے غیر آئینی، غیر قانونی اقدامات سے نہ صرف انہیں روکتے رہے بلکہ ان کا ہاتھ بھی پکڑ لیا- جناب بھٹو نجی محفلوں میں کہا کرتے تھے کہ ”میں اس مولوی سے بہت تنگ ہوں۔“

یہ بات شاید بہت کم لوگوں کے علم میں ہو کہ انہی دنوں ایک بار جب مولانا مفتی محمود اسلام آباد سے پشاور جا رہے تھے تو ان کی کار کو حادثہ سے دو چار کر کے ان کو شہید کرنے کی کوشش کی گئی۔ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ جب مولانا مفتی محمود کی گاڑی اٹک پل عبور کر کے پشاور روڈ پر آئی تو ظاہر ہے کہ وزیراعلیٰ کی کار تھی جس کی وجہ سے رفتار عام حالات کی نسبت قدرے تیز تھی کہ اچانک ایک ٹرک وزیراعلیٰ کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ ڈرائیور بہت ہوشیار تھا اس نے گاڑی بچاتے ہوئے سڑک کے نیچے اتار دی جبکہ ایک ایسا ہی ٹرک وزیراعلیٰ سرحد کی کار

کے عقب میں بھی تھا۔ یہ دونوں ٹرک ٹکرا گئے اور سرحد کے وزیر اعلیٰ کو ذرا سی خراش بھی نہیں آئی لیکن مولانا مفتی محمود نے نہ اس کی رپورٹ درج کروائی نہ ہی بیان دیا کہ وہ ایسے تمام تر حادثات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھے۔ ۱۹۷۶ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے عام انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا تو انہیں تمام سرکاری ذرائع سے ''سب اچھا ہے'' کی رپورٹ دی گئی تھی اور یہ باور کرایا گیا تھا کہ ''لائین کلیئر ہے'' انہوں نے بڑے زور سے عام انتخابات کی تاریخوں کا اعلان فرما دیا۔ اس وقت مولانا مفتی محمود کی قیادت میں ۹ جماعتی قومی اتحاد ان کے مد مقابل آ گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی شکست کو دھاندلی سے کامیابی میں تبدیل کرنے کی سرکاری کوششیں کیں تو یہ مولانا مفتی محمود اور ان کے ساتھی ہی تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر نہ صرف انہیں چیلنج کیا بلکہ جبراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ووٹ کے تقدس کے لیے صوبائی اسمبلیوں کا کامیاب بائیکاٹ کیا۔ عوام نے ووٹ نہیں ڈالے اور سیاسی تحریک نظام مصطفیٰ کی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ جس نے وقت کے آمر کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح مولانا مفتی محمود نے ذوالفقار علی بھٹو کو میدان سیاست میں عملاً شکست سے دوچار کر دیا۔

ایک تاریخی خط

تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران قومی اتحاد نے جو مطالبات پیش کیے تھے۔ بالآخر بھٹو صاحب بات کرنے پر تیار ہو گئے اور مولانا مفتی محمود کو ایک خط ارسال کیا۔ جواب میں مولانا مرحوم نے جو خط لکھا اس کا متن پیش خدمت ہے۔

مائی ڈیئر بھٹو صاحب!

"آپ کا ۱۹ مارچ ۱۹۷۷ء کا خط مجھے ۲۰ مارچ سہ پہر کو موصول ہوا۔ میرے ساتھیوں کی رہائی کے بعد اس خط پر پاکستان قومی اتحاد کی جنرل کونسل کے اجلاس منعقدہ ۲۲ مارچ میں غور کیا گیا۔ آپ کے اس خط کو پڑھنے سے صاف طور پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ اپنے رویہ میں سخت تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان خطوط کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آپ تو اتحاد کے ساتھ بات چیت کرنے کے خواہشمند ہیں۔ لیکن ہم کسی قیمت پر بھی آپ سے بات کرنے پر آمادہ نہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔

آپ نے اپنی پیش کش کی ابتدا ۲۱ مارچ کو ریڈیو، ٹی وی براڈ کاسٹ کے ذریعہ کی۔ حسب عادت اپنی تقریباً ۸۰ منٹ کی تقریر میں اپوزیشن پر بے بنیاد، گھسے پٹے پرانے الزامات کو دہرایا۔ جی بھر کر برا بھلا کہا، دھمکیاں دیں اور واضح طور پر یہ موقف اختیار کیا کہ جہاں تک قومی اسمبلی کے انتخابات کا تعلق ہے یہ ایک طے شدہ معاملہ ہے۔ اس موضوع پر کوئی بات چیت نہیں

ہو سکتی۔ البتہ دیگر امور زیر بحث لائے جا سکتے ہیں۔ اس لیے یہ آپ ہی ہیں جنہوں نے مذاکرات کے دروازے کو پہلے ہی نشریہ میں بند کر دیا۔ کیونکہ ہمارے نزدیک اصل معاملہ ہے ہی یہ کہ ۷ مارچ کے قومی اسمبلی کے الیکشن دستور کے مطابق نہیں ہوئے ہیں۔ ایک طے شدہ منصوبہ کے ذریعہ اس دن پوری قوم کے ساتھ فریب کیا گیا۔ اس لیے اصل مسئلہ قومی اسمبلی کے انتخابات کے انعقاد کا ہے جو آپ کے نزدیک طے شدہ معاملہ اور ناقابل گفت و شنید ہے۔

اپنے ۱۳ مارچ کے خط میں آپ نے اپنی ۱۲ مارچ کی نشری تقریر کو مذاکرات کے لیے پیش کش سے تعبیر کیا جو حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس میں تو آپ نے اپوزیشن کو برا بھلا کہنے کے بعد یہ واضح کر دیا تھا کہ قومی اسمبلی کے انتخابات کے انعقاد پر آپ ہرگز کوئی بات کرنے پر آمادہ نہیں۔ نشری تقریر کے پیش نظر ملک کا وسیع تر مفاد اس بات کا متقاضی ہے کہ موضوع کے تعین کے بغیر بات چیت لا حاصل ہوگی۔ اس لیے آپ گفتگو کی با مقصد پیش کش موضوع کی صراحت کے ساتھ کریں۔ تاکہ ہم اس پر غور کر سکیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ملک کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ اپنے رویہ میں معقول تبدیلی پیدا کریں گے۔

لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اپنے پندرہ مارچ کے خط میں صاف صاف وضاحت کرنے کے بجائے الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ بات کو مزید پیچیدہ بنانے کی کوشش کی۔ آپ نے اس خط میں کہا ہے کہ بات چیت کا دائرہ آپ کے نزدیک بالکل واضح ہے۔ یعنی آپ نے اسی موقف کو دہرایا ہے کہ قومی اسمبلی کے الیکشن کے انعقاد کے بارے میں آپ کوئی مذاکرات کرنے پر کسی قیمت پر بھی آمادہ نہیں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس خط میں آپ نے پھر قومی اتحاد پر بے بنیاد اور سنگین الزام تراشی کی ہے۔ آپ نے کہا کہ آپ کسی ایسی تجویز کو زیر بحث لانے پر آمادہ نہیں ہو سکتے جو دستور کے دائرہ سے متجاوز ہو اور یہ کہ دستور پاکستان کے استحکام کا ذریعہ ہے اور اس سے تجاوز ملک کو خطرناک صورت حال سے دوچار کر سکتا ہے۔ آپ کو دستور اور اس کے مندرجات کا کتنا لحاظ ہے اور آپ نے خود دستور پر کتنا عمل کیا ہے، یہ بات تو یہاں زیر بحث

نہیں لیکن میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ کب اور کہاں ہم نے یہ کہا ہے کہ ہم کوئی ایسا مطالبہ کر رہے ہیں جس سے دستور کی خلاف ورزی لازم آتی ہے اور آپ نے کیسے یہ نتیجہ نکالا کہ ہمارا مطالبہ دستوری حدود کے اندر پورا نہیں کیا جا سکتا- اس خط میں آپ نے نہ صرف یہ کہ موضوع کی صراحت سے دانستہ طور پر گریز کیا، بلکہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ہم دستور کی حدود کو پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں- حالانکہ اب قوم اس حقیقت سے واقف ہے کہ ہماری جدوجہد دستور کی بالا دستی اور اس پر حقیقی طور پر عمل کرنے کے لیے ہی ہے اور دستور کی خلاف ورزی آپ کی جانب سے ہوئی ہے- حالانکہ آپ کا فرض اس پر نیک نیتی سے عمل کرنا اور کرانا تھا-

آپ کے ۱۵ مارچ کے خط میں ہماری درخواست کے باوجود موضوع کی وضاحت نہیں کی گئی بلکہ اسے بھی الزام تراشی کے لیے استعمال کیا گیا- اس میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جس کا جواب دیا جاتا- لیکن پھر بھی ہم اس خط کو جنرل کونسل میں زیر بحث لائے اور ۱۷ مارچ کو میں نے دوبارہ اپنے موقف سے آگاہ کیا- ہم نے آپ کو یاد دلایا کہ ۷ مارچ ۷۷ کو الیکشن کے نام پر پوری قوم کو دھوکہ دیا گیا- رائے دہندگان نے پیپلز پارٹی کو مسترد کر کے قومی اتحاد کے حق میں اپنی رائے کا استعمال کیا- لیکن فریب، دھاندلی اور دھوکہ دہی کے ذریعے نتائج کا اعلان کر دیا گیا- پوری قوم بجا طور پر اس پر مضطرب ہے- ۱۰ مارچ، ۱۱ مارچ اور ۱۴ مارچ سے رونما ہونے والے واقعات قوم کے جذبات کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کر رہے ہیں- غالباً صرف آپ ہی اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہیں لیکن یہ انکار حقیقت کو بدل نہیں سکتا- ہم نے اپنی جانب سے اپنے ۱۷ مارچ کے خط میں اپنے موقف کی دوبارہ وضاحت کر دی کہ دستور کے تقاضوں کے مطابق قومی اسمبلی کے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد قوم کا جائز مطالبہ ہے اور دراصل اپنی دستوری ذمہ داری کو پورا نہ کر کے، بلکہ اس کے بالکل برعکس عمل کر کے آپ اور آپ کی حکومت دستوری خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں- اسی لیے ہم نے پھر آپ سے اپیل کی کہ آپ قوم کے

فیصلہ کو تسلیم کر لیں اور اس کے مطابق عمل کریں۔

لیکن ۱۹ مارچ ۷۷ کے اپنے طویل خط کو بھی آپ نے مذاکرات کے موضوع کے تعین کے بجائے الزام تراشی ہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس خط کے جواب کا انتظار کیے بغیر پوری خط و کتابت کو یک طرفہ طور پر پریس میں شائع کر دینے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس خط و کتابت کا مقصد قومی اتحاد کو مطعون کرنا، معاملہ کو الجھانا اور ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت رائے عامہ کو گمراہ کر کے اس تشدد کے لیے جواز پیدا کرنا ہے، جو عوام پر ان دنوں کر رہے ہیں اور آئندہ مزید کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے اس خط کے دوسرے پیراگراف میں اپنے موقف کے صاف صاف اظہار سے پھر گریز کیا ہے، حالانکہ میں مسلسل آپ سے اس کی وضاحت کی درخواست کر رہا ہوں۔ میں اپنی جانب سے قومی اتحاد کے اس موقف کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ ۷ مارچ کے الیکشن آپ نے اور آپ کی انتظامیہ نے دانستہ طور پر ایک فریب میں تبدیل کر دیے۔ یہ انتخاب دستور کے مطابق ہوئے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے قومی اسمبلی کے از سر نو انتخابات ہونے چاہئیں۔ ہمارے نزدیک یہ انتخاب دستور کی حدود کے اندر ممکن ہیں۔ معاملہ چند نشستوں اور بعض شکایتوں کے ازالہ کا نہیں ہے بلکہ قومی اسمبلی کے انتخاب کا ہے۔

آپ اپنی خط و کتابت اور تقریروں میں دستور کے احترام کا دم بھرتے رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ آپ کا عمل ہمیشہ اس کے برعکس رہا ہے۔ آپ کے دور اقتدار میں ضمنی انتخابات میں جو کچھ کیا گیا ہے، اس سے کون ناواقف ہے۔ خود آپ بھی بعض موقعوں پر ان میں کی جانے والی دھاندلیوں کا اعتراف کر چکے ہیں۔

پھر آزاد کشمیر میں جس شرم ناک طریق پر الیکشن کرائے گئے۔ اس سے بھی آپ کے عزائم ظاہر ہو گئے تھے۔

آپ کے اسی طرز عمل کے پیش نظر اپوزیشن کو یقین تھا کہ جو الیکشن بھی آپ کے دور اقتدار میں ہوں گے، وہ آزادانہ اور منصفانہ نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے اپوزیشن نے بار بار مطالبہ کیا

کہ الیکشن کو دستور کے مطابق بنانے کے لیے چند شرائط پوری کی جائیں- اس بات کو تسلیم کرنے کے بجائے ان کا مضحکہ اڑایا گیا، اپوزیشن کو مطعون کیا گیا اور ہمارے مطالبات تسلیم کرنے سے دوٹوک انکار کر دیا گیا-

ہم جمہوری عمل پر یقین رکھتے ہیں- ہماری خواہش ہے کہ دستور کے مطابق عوام کی آزاد مرضی سے ان کے نمائندوں کا چناؤ عمل میں آئے- اسی مقصد کے حصول کے لیے ۷ جنوری ۷۷ء کو الیکشن کے اعلان کے بعد ہم نے ان انتخابات میں غیر مشروط حصہ لینے کا فیصلہ کیا- کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ خود آپ اور آپ کی پارٹی پچھلے پانچ برسوں سے تنہا میدان میں تھی- اپوزیشن کو عوام سے رابطہ قائم کرنے کے ہر حق سے محروم کر دیا گیا تھا- اپوزیشن کے تمام روزنامے اور رسائل و جرائد کی اشاعت پر پابندی عائد کی گئی- آزاد اخبارات پر بھی ایسی قیود عائد کی گئیں- جس کی مثال دور غلامی میں بھی نہیں ملتی- ریڈیو، ٹی وی اور سرکاری اخبارات کو حکومت کے حق میں جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے اور اپوزیشن کی کردار کشی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا- متفقہ دستور میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں، جن سے عدلیہ بے اختیار ہوئی اور خصوصی عدالتوں اور ٹربیونل نے متوازی عدلیہ کی جگہ لے لی جو عملاً انتظامیہ ہی کا ایک حصہ ہے- شہری حقوق اور آزادیوں کو سلب کیا گیا- اپوزیشن کے رہنماؤں اور کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا- سیاسی قتل اور اغوا کے واقعات عام ہوئے، خواتین تک کو جھوٹے مقدمات میں ملوث کیا گیا- ڈی پی آر کو اپوزیشن کو کچلنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا- وکلاء، طلباء، اساتذہ، مزدور اور کسانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا- ملازمین کو بے بس کر دیا گیا- ہنگامی حالات نے شہریوں کو اپنے تمام دستوری حقوق سے محروم کر دیا- پورا ملک مسلسل دفعہ ۱۴۴ کی گرفت میں رہا- گزشتہ چار برس سے بلوچستان کے عوام کو ظلم کی چکی میں پیسا جا رہا ہے- وہاں کے حالات اس درجہ خراب ہیں کہ ہمارے لیے وہاں انتخاب میں حصہ لینا بھی ممکن نہیں رہا- دیر اور سوات میں بھی اسی طرح مظالم ڈھائے گئے-

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود ہم نے الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا- ۷ جنوری کو الیکشن کی تاریخوں کے اعلان کے ساتھ آپ کی طرف سے قوم کو یقین دہانی کرائی گئی کہ آپ اور آپ کی حکومت انتخابات کو آزادانہ اور منصفانہ بنانے کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گی-

آپ کی یہ زبانی یقین دہانی آزاد الیکشن کے لیے کسی طرح بھی کافی قرار نہیں دی جاسکتی تھی- ہم نے بار بار آپ کی توجہ مبذول کرائی کہ اگر فی الحقیقت آپ اپنے وعدوں میں مخلص ہیں تو بلا تاخیر ایسے اقدامات کریں جن سے قوم میں اعتماد پیدا ہو اور جن کی وجہ سے انتخابات میں کی جانے والی دھاندلیوں کا فوری اور مؤثر سد باب ہو سکے- جنوری اور فروری کے آغاز میں اپوزیشن نے وضاحت کے ساتھ دو باتیں آپ کے سامنے پیش کیں-

اولاً یہ کہ انتخابات کو آزاد اور منصفانہ کرانے کی ذمہ داری الیکشن کمیشن اور چیف الیکشن کمشنر پر ہے لیکن ان دونوں کو کوئی قانونی اور مالی اختیارات حاصل نہیں ہیں- ایسے اختیارات کی عدم موجودگی میں یہ بالکل بے بس ہیں اور کسی طرح بھی اس قابل نہیں ہیں کہ اپنے دستوری فرائض کو پورا کر سکیں- اس لیے اگر آپ اپنے وعدہ میں مخلص ہیں تو ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے درج ذیل اقدامات اٹھائیں-

الیکشن کمیشن اور کمشنر کو ایسے قانونی اور مالی اختیارات دیے جائیں جن کی موجودگی میں وہ اپنے دستوری فرض کو بطریق احسن پورا کر سکیں- بیان میں آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ عوامی نمائندگی کے قانون کی منظوری کے وقت اپوزیشن کی پیش کی ہوئی ترامیم کو رد کر دیا گیا اور اسمبلی سے منظور کرالیا گیا-

ثانیاً یہ کہ الیکشن کمیشن اور کمشنر کو اختیار دیا جائے کہ اگر وہ ضرورت محسوس کریں تو صدر پاکستان سے دستور کے آرٹیکل ۲۴۵ کے مطابق یہ درخواست کر سکیں کہ سول انتظامیہ کی مدد کے لیے افواج پاکستان کو جب اور جہاں ضرورت ہو الیکشن کو آزادانہ اور منصفانہ بنانے کی خاطر طلب کرلیا جائے-

الیکشن میں ملک گیر دھاندلیوں کے بعد تو آپ بظاہر بڑی فیاضی کے ساتھ چیف الیکشن کمشنر کو مزید اختیارات بذریعہ آرڈیننس دے رہے ہیں لیکن افسوس کہ جب ایسا کرنے کا صحیح وقت تھا۔ اس موقع پر آپ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس وقت ایسا کرنا آپ کے ان منصوبوں کو بڑی حد تک ناکام بنا سکتا تھا۔ جن پر آپ عمل کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

سرکاری پارٹی کے مقابلہ میں حزب اختلاف کے امیدواروں کے کاغذات نامزدگی داخل کرانے میں جس طرح رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ امیدواروں اور ان کے تجویز اور تائید کنندگان کو اغوا کیا گیا۔ اس نے آپ کے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرانے کے دعووں کا پول کھول دیا۔ وزیراعظم اور چاروں وزرائے اعلیٰ ناجائز طریقے سے بلامقابلہ منتخب قرار دے دیے گئے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت نے الیکشن کی ابتدا ہی دھاندلی سے کی۔

پھر انتخابی مہم کے دوران نہایت دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کے ساتھ ملک کا خزانہ، وسائل، ٹرانسپورٹ، سرکاری اخبارات کو پیپلز پارٹی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ ہائی کورٹ کے واضح فیصلے کے بعد ریڈیو اور ٹی وی نے اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں کی۔ پرائم منسٹر ہاؤس عملاً پیپلز پارٹی کا دفتر بنا دیا گیا اور پارٹی سرکلر بذریعہ ڈاک بھیجنے کے لیے سروس سٹیمپ استعمال کیے جاتے رہے۔ ہم بار بار اس صورت حال پر احتجاج کر رہے تھے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ آپ کا ایسا کرنا یقیناً اس حلف کے خلاف تھا جو آپ نے اپنے عہدہ پر فائز ہوتے وقت اٹھایا تھا۔

انتخابات کے انعقاد کے اعلان کے بعد بھی بڑے پیمانے پر سرکاری ملازمین کے تبادلے کیے جاتے رہے۔ پیپلز پارٹی کے امیدوار جگہ جگہ کہتے تھے کہ عوام ووٹ جسے چاہے دیں لیکن کامیاب ہم ہی ہوں گے۔ آپ کے امیدوار اسی توقع پر انتخابی مہم میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ آپ نے جس طرح جلسے منعقد کیے یا جلوسوں کا انتظام کیا۔ ان کی نوعیت سے آپ خود بھی واقف ہیں اور پوری قوم بھی آگاہ ہے۔

اپوزیشن کے رہنما بدستور جیلوں میں بند رہے۔ بلکہ نئی گرفتاریاں عمل میں آتی رہیں۔ ریڈیو، ٹی وی ہماری کردار کشی کرتا رہا۔ غلط اور جھوٹا پروپیگنڈا کرنے میں تمام سابقہ ریکارڈ انہوں نے توڑ ڈالے۔

آپ کتنے ہی حسین الفاظ میں اسے جھٹلانے کی کوشش کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۷ مارچ کو قومی اسمبلی کے انتخاب میں جو ملک گیر غنڈہ گردی، دھاندلی اور بے ایمانی کی گئی ہے، اس نے الیکشن کو محض ایک ڈھونگ بناڈالا۔ الیکشن کمیشن کے تینوں ممبران نے اسلام آباد میں کی جانے والی اپنی ۱۲ مارچ کی پریس کانفرنس میں خود اس حقیقت کا اعتراف کرلیا کہ اس روز کی جانے والی بدعنوانیوں، دھاندلیوں، فریب کاریوں اور غیر قانونی حرکات کے ارتکاب کے خلاف پورے ملک سے وصول ہونے والی شکایات سے ان کا دفتر بھرا پڑا ہے۔ پھر چیف الیکشن کمشنر نے اپنے ۱۹ مارچ کے مراسلہ میں جوانہوں نے آپ کو تحریر کیا ہے اس بات کا اعادہ کیا کہ انہیں ایسی شکایات بہت بڑی تعداد میں پورے ملک سے موصول ہوئی ہیں۔ جن میں کہا گیا ہے کہ ۷ مارچ کو قانون کی دھجیاں بکھیری گئیں۔ شدید ترین بدعنوانیوں کا ارتکاب ہوا اور انتخابات کے نتائج کو بدلا اور مسخ کیا گیا۔ خود آپ نے اپنی نشری تقریر میں وفاقی وزراء اور اپنی پارٹی کے کارکنوں کی انتخابی بدعنوانیوں کا اظہار کیا۔ کمیشن کا از خود بہت سے حلقہ ہائے انتخابات سے ریکارڈ کا طلب کرنا بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔ کمیشن نے اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ وہ بدعنوانیوں کے خلاف کوئی اقدام کرنے کے قابل تھے ہی نہیں۔ پاکستان کے کروڑوں عوام اس دھاندلی کے عینی شاہد ہیں اور اس لیے آج پوری قوم سراپا احتجاج بنی ہوئی ہے۔

پاکستان کے عوام کا یہ ناقابل تنسیخ حق ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنے نمائندوں کا انتخاب عمل میں لائیں۔ ۷ مارچ کو قومی اسمبلی کے انتخاب کے موقع پر آپ نے اور آپ کے رفقاء نے غیر دستوری اور غیر قانونی طور پر اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا۔ انتظامیہ کو

اپنے مذموم عزائم کی تکمیل پر مجبور کیا۔ الیکشن میں اتنے بڑے پیمانے پر دھاندلی کی کہ پورا انتخاب بے معنی ہو کر رہ گیا۔ آج قوم اپنا یہی حق مانگ رہی ہے اور اس کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ قومی اسمبلی کے انتخاب بلا تاخیر از سر نو کرائے جائیں۔

آپ نے اپنے مذکورہ خط کے پیراگراف چار میں یہ کہہ کر بڑی زیادتی کی ہے کہ اتحاد ۸ مارچ سے غیر آئینی سرگرمیوں میں ملوث ہے اور آپ بڑے صبر اور تحمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جدوجہد مکمل طور پر پرامن اور آئینی ہے۔ لیکن اسے غیر انسانی ظالمانہ اور بہیمانہ طور پر تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ سینکڑوں بے گناہ پرامن شہری جان بحق ہو چکے ہیں۔ ہزاروں افراد شدید زخمی ہوئے ہیں۔ جیلیں ہمارے کارکنوں سے مسلسل بھری جا رہی ہیں۔ معزز شہریوں کو سر بازار برہنہ کر کے پیٹا جا رہا ہے۔ آنسو گیس کا بے پناہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ گیس بھی ایسی جو اس سے قبل کبھی پاکستان میں استعمال نہیں ہوئی۔ بعض مقامات پر بچوں اور خواتین تک کو گولیوں کا نشانہ بنا کر ہلاک کر ڈالا گیا۔ اب خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ مختلف تعصبات کو ہوا دی جا رہی ہے۔ اتحاد کے رہنماؤں کو بغیر وجہ بتائے گھروں سے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اس سب کے باوجود آپ کا فرمانا ہے کہ آپ صبر اور تحمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میں اس بات کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ ہم نے تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود تحریک کو آئین اور قانون کی حدود میں اب تک جاری رکھا ہے۔

قیمتوں میں اضافے کا الزام آپ ہم پر اس سے قبل بھی عائد کر چکے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ حقیقت تسلیم کرنا آپ کے لیے نہایت مشکل ہے کہ ملک کی موجودہ معاشی مشکلات کا سبب خود آپ کی غلط اقتصادی پالیسیاں، تعیش اور ملکی دولت کا غیر پیداواری کاموں میں ضائع کرنا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اگر آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ اپنی پارٹی کی انتخابی مہم پر آپ نے قوم کا کتنا سرمایہ صرف کیا ہے اور کس دستوری اختیار کے تحت آپ نے قومی وسائل کو اپنی پارٹی کے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا جائز سمجھا۔ کاش آپ الزام تراشی کی

روش ترک کر کے اصل معاملہ کو سمجھنے حقائق کو تسلیم کرنے اور مسائل کو مؤثر طور پر حل کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتے۔

شکایات کے ازالہ کا جو حل آپ نے اپنے خط میں تجویز کیا ہے۔ وہ قوم کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک معاملہ چند نشستوں یا بہت سی نشستوں کا نہیں ہے۔ بلکہ پورے انتخاب کا ہے۔ ہم ۷ مارچ کے پورے انتخاب کو قوم کے ساتھ ایک سنگین مذاق سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان نشستوں سے بھی دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے۔ جہاں سے اتحاد کے امیدواروں کو منتخب قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ عوام کو اپنی مرضی سے اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔ ہماری جدوجہد عوام کے اس بنیادی حق کو منوانے کے لیے ہے نہ کہ نشستوں کے حصول کے لیے کوئی سودے بازی کرنا چاہتے ہیں۔

انتخاب کا مطالبہ صرف قومی اتحاد کا ہی مطالبہ نہیں ہے، پوری قوم کا مطالبہ ہے ملک کی تقریباً تمام وکلاء تنظیمیں اس مطالبہ کی توثیق کر چکی ہیں۔ عدلیہ سے تعلق رکھنے والے معزز اصحاب اس کی تائید کر رہے ہیں۔ میں پورے اخلاص اور دردمندی کے ساتھ آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آئین کی بالادستی ملک کے استحکام جمہوری اقدار کے تحفظ اور معاشی خوش حالی کی خاطر آپ اپنی روش میں تبدیلی پیدا کریں اور وطن عزیز کو اپنے پیدا کردہ سیاسی بحران سے نکالنے کی مخلصانہ کوشش فرمائیں۔

آپ کا ہر خط ملنے کے ساتھ ہی مجھے ملک کے مختلف حصوں سے ایسی اطلاعات ملنا بھی شروع ہو جاتی ہیں کہ تشدد اور ظلم کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ خط و کتابت کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کو زیادہ سخت رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کس مقصد کے لیے دی جاتی ہے۔

قومی اتحاد کا موقف بالکل واضح ہے۔ اگر آپ ہمارے ۱۲ مارچ کو پیش کیے ہوئے مطالبات کو تسلیم کر لیں تو ان مطالبات کو موجودہ دستور کے اندر رہتے ہوئے پورا کرنے کے

طریقۂ کار پر ہم آپ سے ہر وقت ہر جگہ بات چیت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے مطالبات پر عمل کرنے کے لیے دستور میں کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

آپ نے اپنے ۱۹ اپریل ۷۷ء کے خط کے جواب کا انتظار کیے بغیر پریس کو برائے اشاعت جاری کر دیا تھا۔ اس لیے میں اپنا یہ جواب بھی پریس کو جاری کر رہا ہوں۔

مسٹر ذوالفقار بھٹو
چیئرمین پاکستان
پیپلز پارٹی، پرائم منسٹر
ہاؤس، راولپنڈی

آپ کا مخلص
مفتی محمود
صدر پاکستان قومی اتحاد

ایک تقریر-ایک لائحہ عمل

۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو نظام شریعت کانفرنس گوجرانوالہ میں مولانا مفتی محمود کا خطاب، یہ تقریر مولانا مرحوم کے دور حکومت اور بہت سے اور حلقہ کا مکمل احاطہ کرتی ہے-

جناب صدر، برادران ملت بزرگوار اور عزیز بھائیو:

"نظام شریعت کنونشن کا یہ آخری اجلاس ہے- نظام شریعت کے نام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کنونشن کا مقصد اور اس کا پروگرام کیا ہے؟ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد اٹھائیس انتیس سال گزر چکے ہیں- اور جب کہ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا- شریعت کے نام پر یہ ملک معرض وجود میں آیا تھا- پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کو پاکستان بنانے پر اکٹھا کیا گیا- لیکن آپ نے دیکھا تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں کے حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے ہمیشہ سے اسلامی نظام کے قیام سے انحراف کیا- (سوالیہ انداز میں) آخر آپ بتائیں اسلام کے نظام میں کیا مشکلات ہیں؟ وہ نظام کیوں نافذ نہیں ہوتا؟ اس میں رکاوٹ کون ہے؟ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو کیوں درخور اعتنا نہیں سمجھا جا رہا؟ یہ جرم کس کا ہے؟ (پرجوش لہجے میں، میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ چند مغرب زدہ، ملحد اور بے دین لوگ جو پاکستان کی سیاست پر مسلسل چھائے رہے- یہی لوگ اسلام کے نفاذ کی راہ میں رکاٹ ہیں" (استغفر اللہ، استغفر اللہ کی آوازیں اور آئے گا آئے گا اسلامی نظام آئے گا" کے نعرے)-

غدار کون ہیرو کون:

''میں کہا کرتا ہوں حقیقت میں ہم آج تک آزاد نہیں ہیں، آزادی بھی دھوکہ ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی غلام قوم آزادی کی جنگ لڑتی ہے اور سامراجی طاقت کو شکست دینے کے بعد آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد حکومت قائم کرتی ہے تو آزاد حکومت کے لیے اجلاس میں لازماً دو فیصلے کیے جاتے ہیں۔ تاریخ عالم دیکھیں کسی بھی غلام قوم نے قربانیاں دے کر جب بھی آزادی حاصل کی تو آزاد گورنمنٹ کی کابینہ نے سب سے پہلے دو فیصلے کیے:

''پہلا یہ کہ آزادی کی جنگ میں قوم سے غداری کس نے کی؟ سامراجی طاقت سے اعزازات اور خطابات حاصل کرنے والے کون تھے؟ سر اور خان بہادر کے خطاب کس نے حاصل کیے؟ جاگیریں اور مراعات کس نے حاصل کیں؟ قوم کے ان حقیقی غداروں کی باقاعدہ نشان دہی کے بعد انہیں قوم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ غداری کے جرم میں سزا دی جاتی ہے' کسی کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا جاتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے قوم سے غداریاں کیں، وہ ذلیل و خوار اور تباہ ہو جاتے ہیں، آزاد ملک میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔''

دوسرا فیصلہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ کون تھے جنہوں نے جنگ آزادی لڑی؟ وہ کون تھے جنہوں نے قربانیاں دیں؟ وہ کون تھے جو جلاوطن ہوئے' شہید ہوئے؟ وہ کون تھے جن کی جائیدادیں ضبط ہوئیں، جو جیلوں میں گلے سڑے اور مرے؟ ان لوگوں کی بھی باقاعدہ نشاندہی کر کے فہرست بنائی جاتی ہے۔ انہیں قومی ہیرو قرار دیا جاتا ہے، انہیں اعزازات دیے جاتے ہیں، انہیں خطابات دیے جاتے ہیں، ان کی یادگاریں بنائی جاتی ہیں۔

یہ بوٹ پالش والے:

مگر آپ دیکھیں کہ ہم بھی آزاد ہوئے...... مگر آزادی کے بعد ہوا کیا؟ جو لوگ

انگریزوں کے بوٹ پالش کرتے تھے، قوم سے غداری کرتے تھے، پاکستان میں با اختیار
ہوئے- سروں اور نوابوں کے بیٹے پاکستان میں اقتدار کی کرسیوں پر ہیں- وہ لوگ آج
پاکستان میں معزز قرار دیے جاتے ہیں- جنہوں نے قوم سے غداری کی تھی اور وہ لوگ جو اس
وقت سامراجیوں کی مخالفت کی وجہ سے جیلوں میں تھے، آج بھی جیلوں میں ہیں- وہ جنہوں
نے انگریزوں کا مقابلہ کر کے انگریزوں کو یہاں سے جانے پر مجبور کر دیا، آج سی آئی ڈی ان کا
تعاقب کرتی ہے- انہیں غدار اور ففتھ کالمسٹ کہا جاتا ہے- کتنی عجیب بات ہے، انگریزوں کے
بوٹ پالش کرنے والے معزز ہیں، محبّ وطن ہیں اور ان سے لڑنے والے بھڑنے والے غدار!
(گرج دار آواز میں) کیا دنیا میں کبھی ایسا ہوا (سامعین پرجوش انداز میں کہتے ہیں: نہیں نہیں

بالکل نہیں)
ہمارا مقابلہ انگریز کی نیلی
”محترم دوستو! اسی لیے تو میں کہتا ہوں، ہم آزاد نہیں ہیں-
آنکھوں اور گوری چمڑی سے نہ تھا- ہم اس کے تشدد، بے دینی، الحاد اور اسلام دشمنی کی وجہ سے
سینہ تان کر اس کے سامنے ڈٹ گئے تھے- اگر آج بھی وہی پالیسیاں ہوں، تو ہمیں پروا نہیں-
چمڑا گورا ہو کالا، آنکھیں نیلی ہوں کالی، جب تک غداروں کو ٹھکانے نہیں لگا دیتے' ہماری جنگ
جاری رہے گی- (نعروں کی گونج سے فضا لرز رہی ہے)
”محترم دوستو! ہم کہاں تک صبر کریں؟ ہمارے صبر کے پیمانے لبریز ہو چکے ہیں- ہم
دیکھتے ہیں پاکستان کی کرسیوں پر براجمان لوگ وفادار نہیں- مشرقی پاکستان کے سقوط کی ذمہ
داری کس پر ہے؟ (اہل اقتدار کے حوالے سے نعرے لگتے ہیں) بنگلہ دیش کو بنانے کی ذمہ
داری کس پر ہے؟ (آوازیں: ”بھٹو پر“ ہم نے تو پاکستان کو تقسیم نہیں کیا- ہمارا مزاج اس تقسیم
کو قبول نہیں کرتا- ہم نے مقابلہ کیا، مگر یار لوگوں نے اسے تقسیم کر ڈالا- میں بتاؤں گا کس نے
تقسیم کیا ملک کو، میں بتاؤں گا بنگلہ دیش کس نے بنایا- ہم تقسیم میں حصہ دار نہیں ہیں- خدا
نخواستہ پھر ایسی نوبت آئی: (آوازیں ”خدا نہ کرے، خدا نہ کرے“ تو بھی ہماری ذمہ داری نہ

ہوگی- اس کے ذمہ دار وہ ہوں گے جو تقسیم کے قائل ہیں- اگر ہم ہندو کے ساتھ تقسیم پر بھی راضی نہ تھے، تو مسلمانوں کے ساتھ تقسیم پر کس طرح راضی ہو سکتے ہیں؟

دو وزیر اعظم، دو قومی اسمبلیاں

''عجب بات ہے قوم بھول چکی ہے کہ ادھر تم، ادھر ہم کا نعرہ کس نے لگایا؟ وہی ذمہ دار ہے تقسیم پاکستان کا، وہی ذمہ دار ہے سقوط مشرقی پاکستان کا، وہی ذمہ دار ہے قیام بنگلہ دیش کا، کہا گیا دو قومی اسمبلیاں ہوں، ایک ڈھاکہ میں ہو، ایک اسلام آباد میں...... دو وزیر اعظم ہوں، ایک ڈھاکہ میں ہو، ایک اسلام آباد میں- انہی لوگوں کی وجہ سے دو قومی اسمبلیاں بھی بنیں، دو وزیر اعظم بھی بنے- ایک قومی اسمبلی ڈھاکہ میں دوسری قومی اسمبلی اسلام آباد میں- ایک وزیر اعظم ڈھاکہ میں، دوسرا وزیر اعظم اسلام آباد میں- ادھر تم ادھر ہم کا نعرہ عملی صورت اختیار کر گیا- تو کیا ثابت نہ ہو گیا کس نے تقسیم کیا ملک؟ (آوازیں: ''ثابت ہو گیا'')

فساد زدہ علاقہ......سارا پاکستان

''آج ہم نے جو یہاں اجتماع رکھا یہ کس دقت اور گھٹن کے ساتھ مسجد میں منعقد کر رہے ہیں- دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے- اجتماعات پر پابندی ہے- آج تقریباً تمام ملک میں ہر جگہ ۱۴۴ نافذ ہے، جلسوں پر پابندی ہے، اظہار خیال پر پابندی ہے، تحریر و تقریر پر پابندی ہے، فکر خیال پیش کرنے پر پابندی ہے، نقل و حرکت پر پابندی ہے، پورے پاکستان میں ایک گز زمین ایسی نہیں، جہاں آپ آزادی کے ساتھ اجتماع کر سکیں (آوازیں: ''شرم، شرم)

''یہ دفعہ ۱۴۴ عام سا قانون ہے...... دستور پاکستان جس کا حلف بھٹو نے اٹھایا، مرکزی وزیروں نے اٹھایا- سب نے اٹھایا، اس میں بنیادی حق کے ذریعے تحریر و تقریر اور اجتماعات کا حق ملا ہے- ملک کا کوئی قانون بھی جب دستور کی دفعہ سے ٹکرا جائے، تو ملک کا قانون کالعدم

ہو جاتا ہے۔ دستور کو فوقیت حاصل ہوتی ہے، مگر آج دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ (دستور کو کوئی پوچھتا نہیں، یہ دفعہ ۱۴۴ کس لیے ہے؟ یہ معمولی قانون اس ضرورت کے لیے ہے کہ اگر کہیں فساد ہو جائے، کسی محلے میں بدامنی پھیل جائے، دو فریق آمنے سامنے ہوں، فساد کا شدید خطرہ ہو تو اس ایریا (علاقے) میں جہاں فساد کا خطرہ ہو، اتنے وقت کے لیے جس میں فساد فرو ہو جائے یہ قانون لاگو ہوتا ہے۔ مگر آج یہ سارے پاکستان میں لاگو ہے۔

”جناب بھٹو یہ بتائیں، کیا سارے پاکستان میں بدامنی اور فساد ہے؟ کیا سارا پاکستان فسادزدہ علاقہ ہے؟ پورے پاکستان کی سرزمین میں ایک گز کا ٹکڑا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں؟ اگر پورا پاکستان فسادزدہ ہے تو میں بھٹو سے کہوں گا کہ جب تم پاکستان کی ایک گز زمین پر بھی امن قائم رکھنے میں ناکام ہو گئے ہو تو پاکستان کی ہزاروں مربع میل سرزمین پر حکومت کا حق کیسے حاصل ہے تمہیں؟ میں کہتا ہوں تم مستعفی ہو جاؤ (نعرے: ”مرحبا، مرحبا...... فاتح بھٹو مرحبا“)

محترم دوستو! ہم کہتے ہیں ہم بتاتے ہیں تمام پاکستان میں فساد نہیں، تمام پاکستان فسادزدہ علاقہ نہیں۔ صرف سیاسی مخالفین کا سیاسی عمل، سیاسی سرگرمیاں روکنے کے لیے عوام کے دستوری حقوق غصب کر لیے گئے ہیں۔ عوام کے آئینی حقوق سلب کرنے کا کسی کو حق نہیں، جو ایسا کرتے ہیں، انہیں مستعفی ہو جانا چاہیے۔ (گرج کر) کیوں ہم پر وارد ہو، کیوں ہم پر نازل ہو، چھوڑو ہماری جان

”ان حالات میں ہم آزادی کی نعمتیں اور مسرتیں کیسے محسوس کریں؟ ۲۸ برس سے قوم پسی جا رہی ہے۔ کہیں لوگ یہ کہنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اس آزادی سے تو غلامی بہتر تھی۔ ان حکمرانوں سے تو انگریز ہی بہتر تھے۔ میں غلامی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میرے نزدیک آزادی کا ایک لمحہ غلامی کے ہزار برس سے بہتر ہے۔ افضل ہے، اچھا ہے، مگر ہمارے حکمرانوں نے ہماری آزادیاں سلب کر لی ہیں۔ آزادیاں سلب کرنے والوں کو ہم پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں (آوازیں: ”بالکل نہیں“)

بائیکاٹ کیوں کیا، ختم کیوں ہوا؟

''محترم دوستو! ہم اس سلسلے میں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آج پاکستان میں جمہوری عمل روک دیا گیا ہے۔ جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ جمہوری ادارے غیر ضروری ادارے بنا دیے گئے ہیں۔ اسی لیے تو ہم نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا۔ یہ بائیکاٹ نو مہینے جاری رہا۔ سینٹ میں، قومی اسمبلی میں، تمام اسمبلیوں میں اپوزیشن کے بنچ خالی رہے۔ مگر بائیکاٹ خود بخود مقصود نہ تھا۔ اس کے لیے ہمیں مجبور کر دیا گیا۔ ہم چاہتے تھے اگر خود ان میں حیا نہیں، تو بین الاقوامی حالات سے مجبور ہو کر عوام کو حقوق دے دیں۔ مگر ہوا کیا؟ ایسے بے حیا لوگوں سے واسطہ پڑا (زور کا قہقہہ) ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا کہ نو ماہ کے بائیکاٹ کے باوجود شرم کا ایک قطرہ ان کے ماتھے پر نہ آیا۔ آخر ہم نے سوچا احتجاج کا کوئی اور طریقہ دیکھیں، چنانچہ متحدہ محاذ کی میٹنگ میں بائیکاٹ ختم کرنے کا جو فیصلہ ہوا، اس کا مقصد یہ نہیں کہ بائیکاٹ ختم ہو گیا۔ اب ہم نئے طرز کی تحریک شروع کرنے والے ہیں۔ عوامی تحریک شروع کرنے والے ہیں۔ (سامعین وفور جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں، فلک شگاف نعرے لگ رہے ہیں) ہم ملک بھر میں، عوام کے پاس جا کر ان کے مظالم کی تفصیلات پیش کریں گے، ہم عوام کو متحد ہو کر ظالموں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دیں گے (نعرہ ہائے تکبیر گونج رہے ہیں)

''میرے دوستو! یہی وجہ تھی ہم نے ضمنی انتخاب کا بائیکاٹ کیا۔ تمام ضمنی انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ بہت سے دوست کہتے ہیں ضمنی انتخابات میں حصہ لو، یہ جمہوری عمل کو جاری رکھنے کا وسیلہ ہے۔ مگر جس ملک میں اکثریت اور اقلیت کی تمیز ختم ہو جائے، وہاں جمہوری عمل کا تصور کیسا؟ سرحد اور بلوچستان میں ہم نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ان کو شکست دی۔ ستر کے بعد کوئی عام انتخاب نہیں ہوئے۔ ستر کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو سرحد سے صرف ڈھائی سیٹیں ملیں۔ (ایک آواز: ''ڈھائی کیسے جی) وہ ایسے کہ حیات شیرپاؤ مرحوم پیپلز پارٹی کا امیدوار نہ

تھا- اس کے ساتھ قیوم خان کا مقابلہ تھا شہر کے حلقے میں-

صوبائی انتخابات سے دس دن پہلے اسی حلقے سے قومی اسمبلی کی نشست کے لیے شیر پاؤ خاں قیوم خان کھڑے تھے- قیوم خان نے شیر پاؤ کو شکست دی، پھر دس دن بعد شیر پاؤ خاں نے قیوم خان کو شکست دے دی صوبائی انتخابات میں- تو جناب یہ دس دن میں کیا سے کیا کیسے ہو گیا؟ ایسے ہو گیا کہ نیشنل عوامی پارٹی نے اپنے امیدوار الالہ ایوب کو شیر پاؤ خاں کے حق میں بٹھا دیا اور غیر مشروط طور پر تمام ووٹ شیر پاؤ کو دیے- اگر نیپ نہ بٹھاتی تو جو شیر پاؤ کا قومی اسمبلی کی نشست پر حشر ہوا تھا وہی صوبائی نشست پر ہوتا- چونکہ شیر پاؤ کی کامیابی آدھی پیپلز پارٹی اور آدھی نیشنل عوامی پارٹی کی وجہ سے ہوئی- اس لیے میں کہتا ہوں یہ آدھی سیٹ ہے اور کل ان کی ڈھائی سیٹیں-

ڈھائی سیٹیں......پھر بھی حکمران!

بیالیس کی صوبائی اسمبلی میں ڈھائی سیٹیں (ایک آواز اندازہ لگاؤ) اور قومی اسمبلی میں انیس سیٹوں میں سے پیپلز پارٹی نے صرف ایک سیٹ حاصل کی- مردان کی سیٹ عبدالخالق خان کی سیٹ، مگر چند دن کے بعد عبدالخالق خان ان سے الگ ہو گئے- آج عبدالخالق خان قومی اسمبلی میں ہمارے ساتھ بیٹھتے ہیں- آج قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کا کوئی منتخب شدہ نمائندہ قومی اسمبلی میں نہیں (ایک آواز سبحان اللہ)

محترم دوستو! سرحد نے مکمل طور پر پیپلز پارٹی کو مسترد کر دیا اور صرف پیپلز پارٹی ہی نہیں، وہاں تو پیپلز پارٹی کے چیئرمین صاحب بھی مسترد ہو گئے- (جناب بھٹو ڈیرہ اسماعیل خان کی نشست سے مفتی محمود کے مقابلے میں الیکشن لڑے تھے- جیت مفتی محمود کی ہوئی تھی)- جہاں سے پارٹی اور پارٹی کی چیئرمین صاحب مسترد ہو گئے وہاں آج کس کی حکومت ہے؟ (مختلف آوازیں: ایک آواز" پیو، پلاؤ پارٹی) اندازہ کیجیے صوبائی اسمبلی میں ڈھائی رکن اور قومی میں

ایک بھی نہیں- حکومت پھر بھی پیپلز پارٹی کی-

بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی زیرو (صفر) پوزیشن تھی- قومی اور صوبائی سب نشستوں پر اس کے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوئیں- کسی ایک کی بھی ضمانت نہ بچی- مگر آج دیکھو کون کر رہا ہے حکومت (آوازیں: ''بھٹو'') تو ثابت ہو گیا، معلوم ہو گیا کہ انتخاب اور اسمبلیوں کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں- تم جیتو تو بھی حکومت ان کی، وہ جیتیں تو بھی حکومت ان کی......

(غصے میں بپھر کر) ایسی جمہوریت پر میں لعنت بھیجتا ہوں (نعرے)

جب انتخابات پر سے اعتماد اٹھ گیا، جب اسمبلیوں کی اکثریتی پارٹیوں کو جیلوں میں ٹھونس کر، جرگوں سے اٹھائیس اٹھائیس برس کی سزائیں دے کر سیٹیں خالی کرالی جائیں تو بیلٹ پیپر پر اعتماد کیسے رہے گا؟ یہ الیکشن نہیں سلیکشن ہے- سلیکشن کو قبول کرنے پر قطعاً تیار نہیں ہیں ہم-

۱۹- اکتوبر کو پنجاب کے صوبائی اور کراچی کے قومی انتخابات کے نتائج بھی دیکھ سن لیے آپ نے- میں نے کہا تھا منصفانہ انتخابات کی صورت میں پچانوے فیصد ووٹ لاہور میں کھرے ہیں- مگر دھاندلی سے کیا نتیجہ نکالا گیا؟ اب ووٹر اور ووٹر کا نہیں، ووٹر اور دھاندلی کا مقابلہ ہے (زور کا قہقہہ) ایسی صورت میں جمہوری عمل جاری کرنے کی بات کرنا خود کو اور دنیا کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے- ان حالات میں سوائے بائیکاٹ کے ہم کیا کریں؟ اخبارات پر پابندی ہے- ہماری بات اخبارات میں چھپ نہیں سکتی- عظیم اجتماع سامنے ہے- میں شرطیہ کہتا ہوں کہ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے ہماری بات، ہماری آواز عوام تک نہ پہنچے گی-

قاتل معلوم ہے

سیاسی قتل کیے جا رہے ہیں- سیاسی مخالفوں کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا ہے- ڈاکٹر نذیر ایم- این اے ڈیرہ غازی خان میں شہید کر دیا گیا- مولانا شمس الدین ڈپٹی سپیکر بلوچستان اسمبلی کو

ایک شقی القلب کے ذریعے قتل کرایا گیا (سامعین غصے اور جوش میں پھر کر نعرے لگاتے ہیں) عبدالصمد خان اچکزئی ایم پی اے پر بم پھینک کر قتل کرایا گیا۔ خواجہ رفیق کو لاہور میں شارع عام پر شہید کرایا گیا۔ احمد رضا خان قصوری ایم این اے پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا، اس میں ان کے والد (نواب محمد احمد خان شہید ہو گئے۔

کسی بھی مقتول کے قاتل کو پکڑا نہیں گیا۔ ۲۳۔ مارچ ۱۹۷۳ء کو پنڈی لیاقت باغ میں ہم پر تین چار گھنٹے تک گولیاں چلائی گئیں۔ ہزاروں گولیاں سروں سے گزریں۔ بارہ تیرہ جانیں ضائع ہوئیں۔ سینکڑوں آدمی زخمی ہوئے۔ جمعہ کا دن تھا جمعہ پڑھنے کے بعد ایک کھلے میدان میں ہمارا جلسہ تھا۔ ایک منصوبے کے تحت حملہ کیا گیا۔ مگر ایک شخص گرفتار نہیں ہوا۔ نہ عدالت کے ذریعے تحقیقات کا اہتمام ہوا۔ سیاسی قتل کا قاتل ہمیشہ نامعلوم ہوتا ہے۔ سیاسی قتل کی نشاندہی ہی یہ ہوتی ہے کہ اس کا قاتل گرفتار نہیں ہوتا...... معلوم ہوتا ہے، تب بھی معلوم نہیں ہوتا۔

پنجاب بھی غدار ہو گیا:

پہلے کہا جاتا تھا سندھ اور بلوچستان کے لوگ غدار ہیں۔ سرحد کے لوگ غدار ہیں، چھوٹے صوبوں کے لوگ غدار ہیں۔ اس لیے غدار ہیں کہ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر اب پنجاب بھی غدار ہو گیا (قہقہہ) غداری قدر مشترک ہو گئی۔ پنجاب سے بھی مصطفیٰ خاں کھر اور حنیف خاں رامے صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرنا غداری ہے، اگر جائز حق مانگنا غداری ہے تو ہم سب غدار ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں اضافہ ہوا (نعرے: ''صوبائی خودمختاری بحال کرو'')

قرضہ واپس دو:

مجھے پنجاب کے لوگوں سے شکایت ہے، میں پنجاب کے لوگوں سے گلہ کرنے آیا ہوں۔ آپ نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں دھوکہ کھا کر ایک پارٹی کو ووٹ دیا۔ روٹی، کپڑا، مکان کے نعرے کا دھوکہ کھایا۔ سرحد کے لوگ، بلوچستان کے لوگ آپ سے زیادہ مہذب ہیں۔ انہوں نے روٹی کپڑا مکان کا دھوکہ نہیں کھایا، آپ نے کیوں کھایا؟ آپ دانشور ہیں، آپ تعلیم یافتہ ہیں، آپ کھاتے پیتے ہیں۔ وہ غریب ہیں، مفلس ہیں، قلاش ہیں، ان پڑھ ہیں اور انہیں روٹی تو کجا، پینے کا پانی بھی نہیں ملتا۔ وہ غلط فیصلہ نہ کر پائے' آپ نے کیوں کیا؟ (آوازیں: ''ہم شرمندہ ہیں'') یہ اجتماع ثبوت ہے اس بات کا کہ آپ ۱۹۷۰ء کے فیصلہ پر نادم ہیں۔

آپ دیکھ لیں ہم نے فیصلہ صحیح کیا تو وہاں حکومت کرنے کا حق حاصل ہوا۔ ہم نے حکومت کی بھی مگر مرکز میں آپ نے جس پارٹی کو آگے بڑھایا، آج وہ آپ ہی کی فراہم کردہ طاقت کو غلط استعمال کر کے بلوچستان کے ہزاروں لوگ جیلوں میں ہیں (بلوچستان کا ایک نوجوان غصے میں بپھر کر حکمرانوں کے خلاف نعرے لگاتا ہے) کیوں؟ کیا اس لیے کہ ہم نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔

محترم دوستو! پنجاب کی بخشی ہوئی طاقت کو بھٹو نے استعمال کر کے ہم پر ظلم کیا۔ میں گلہ کرنے آیا ہوں، میں گلہ کرتا ہوں کہ تم نے غلط فیصلہ کر کے ان کو طاقت بخشی اور وہی طاقت ہمارے پر ظلم کرنے کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ آپ نے اپنا بیڑا ابھی غرق کر دیا اور ساتھ ہمارا بھی۔ ہمارا آپ پر قرضہ ہے، قرضہ واپس دو، میں قرضہ واپس مانگنے آیا ہوں۔ قرضہ واپس اس طرح دو کہ آئندہ انتخابات میں ووٹ ظالم طاقتوں کو نہ دو۔

مولوی کی حکومت:

ہم وہاں سرحد میں اپنے حق کے مطابق حکومت کر رہے تھے۔ ہمارے خلاف پروپیگنڈہ تھا کہ مولوی حکومت نہیں کر سکتا۔ ہم نے عملی ثبوت دیا کہ ہم حکومت کر سکتے ہیں اور اچھی کر سکتے ہیں۔ دفعہ ۱۴۴ کے زور پر حکومت کرنا کوئی حکومت نہیں۔ لاٹھی کے زور پر حکومت کرنا، گولی کی مدد سے حکومت کرنا، آنسو گیس کی مدد سے حکومت کرنا ذلیل انسان کا کام ہے۔ (آوازیں: ''بے شک'') حکومت ہم نے بھی کی، ساڑھے نو ماہ کی۔ (پرجوش لہجے میں) میں چیلنج کرتا ہوں، ثابت کرو کہ میں نے اس دوران کسی جگہ دفعہ ۱۴۴ نافذ کی؟ پولیس نے ایک بھی شہری پر ڈنڈا مارا؟ یہ ثابت کر دیں، تو میں سیاست سے ریٹائر ہو جاؤں گا (نعرے) اگر ثابت کر دیں میرے دور میں پولیس کی ایک گولی بھی عوام پر چلی ہو، میں ان کا مقابلہ کرنا چھوڑ دوں گا (نعرے: ''وزیراعظم، وزیراعظم مفتی اعظم، مفتی اعظم) یہ ثابت کر دیں اس دوران کسی اجتماع کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس کا ایک بھی گولہ پھینکا گیا ہو تو میں قوم کی عدالت میں کھڑا ہوں، قوم مجھے سزا دے۔ (نعرے: ''ساڈا مفتی...... آوے ای آوے'') میں مولوی ہونے کے باوجود دفعہ ۱۴۴ کے بغیر لاٹھی گولی کے بغیر، آنسو گیس کے بغیر حکومت کر سکتا ہوں اور تم نہیں کر سکتے۔ تم نہیں کر سکے، تم مستعفی ہو جاؤ۔

مجھے فخر ہے کہ میں نے شہری آزادیاں بحال رکھیں۔ اس لیے کہ میں نے ساری زندگی شہری آزادیوں کی بحالی کے لیے جہاد کیا۔ میں شہری آزادیاں کیسے سلب کرلوں؟ میں جلسے کا جواب جلسے سے دوں گا۔ (نعرے: ''مفتی ساڈا شیر اے۔ باقی ہیر پھیر اے) مرکز کے وزراء آئے۔ صوبے میں فتنہ پیدا کرنے کے لیے جلسہ ہائے عام میں اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ مزارعین سے کہا زمینداروں کو چڑیوں کی طرح مار دو، بندوق کا نشانہ خالی نہ جائے۔ ہمارے خلاف عوام کو اکسانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ جلسے اور جلوس ہوئے، مگر ہم مطمئن تھے

کہ سیاسی مقابلہ کرسکتے تھے۔ ہم نے جلسے کا جواب جلسے سے دیا۔ مرکز کی فتنہ پرور پالیسیوں کو ناکام بنادیا۔ مگر یہ تو ڈرتے ہیں (گرج کر) میں کہتا ہوں یہ اپنی جمہوریت دشمن حرکتیں بند کر دیں۔ شہری آزادیاں بحال کردیں۔ جلسے جلوس کی اجازت دیں تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ایک ماہ کے بعد بھٹو کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ (آوازیں: ”نہیں رہے گی“)

میں نے انکار کردیا:

یہ لوگ کیا حکومت کریں گے؟ یہ جانتے ہی نہیں حکومت کرنا۔ انہیں آتا ہی نہیں حکومت کرنا۔ یہ تو انگریزوں کے اشارے پر چلنے والے لوگ ہیں۔ انہوں نے یہی سیکھا۔ (دونوں ہاتھ جوڑ کر) کہ جی حضور، (قہقہے) اسلم خان خٹک نے جنہوں نے ہماری پارٹی سے غداری کر کے بھٹو سے گورنری لی، گورنر بنے تو اعلان کیا، بھٹو صاحب کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے (اسلم خٹک کے خلاف نعرے) کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، وہ ٹوڈی روایات کا حامل ہے۔

ہم جانتے تھے، بھٹو ہم سے غلط کام کرانا چاہتا ہے۔ دوراستے تھے، ایک یہ کہ جی حضوری کی حکومت کریں، دوسرا راستہ تھا عزت نفس۔ ہم نے کرسی کو لات ماردی۔ عزت نفس کو قائم رکھا۔ کرسی کی حیثیت کیا ہے؟ اصولوں پر قائم رہنا انسانیت ہے۔ خوشامدی بن کر کرسی پر بیٹھنا، بے عزت بن کر کرسی پر بیٹھنا، انسانوں کا کام نہیں۔ ہم نے استعفیٰ دیا، تو میری منتیں کیں۔ پھر اقتدار سنبھالو، میں نے انکار کردیا (نعرے: ”مفتی محمود زندہ باد“) جو بعد میں آئے (گنڈاپور کابینہ) ان کو کان سے پکڑ کر نکال دیا، ان کا حشر برا ہوا۔

سہرا کس کے سر ہے؟

جہاں تک اسلامی نظام کا تعلق ہے، میں بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کو اسلام دشمن ذہن کا

مقابلہ کرنا ہے۔ یہ ذہنیت اس ٹولے کو انگریز سے ورثے میں ملی ہے۔ اس ذہن کو شکست دینا ہو گی۔ انقلاب شکلوں کی تبدیلی سے نہیں آتا۔ غلام محمد آیا، سکندر مرزا آیا، ایوب خان یحییٰ خان اور پھر بھٹو خاں۔ یہ شکلوں کی تبدیلیاں ہیں، ذہن تو وہی ہیں۔ ہمیں تو بنیادی طور پر ذہن تبدیل کرنے ہیں۔ ہمارا مقابلہ ذہنوں سے ہے، شکلوں سے نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کا نظام کیسے لائیں۔ کیسے نافذ کریں؟ جو لوگ اپنے پانچ ساڑھے پانچ فٹ کے جسم پر اسلام نافذ نہیں کر سکتے پورے ملک میں نظام اسلام لا سکیں گے؟ ان لوگوں سے خیر کی توقع نہیں۔ ہمارے بعض ساتھی کہتے ہیں۔ یہ نظام اسلام نافذ کر دیں، تو مقابلہ چھوڑ دیں گے۔ میں اس بات کا مخالف ہوں۔ ہم تو پہلے انہیں نکال باہر کریں گے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی نظام اسلام نافذ ہو سکے گا۔

محترم ساتھیو! جب آئین بن رہا تھا، ہم نے اس وقت بھی بائیکاٹ کیا تھا...... بائیکاٹ ختم کرنے کے لیے ہم نے دستور میں گیارہ ترامیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ آخری خواندگی مکمل ہونے والی تھی، پاس ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ شیخ رشید ہمارے وزیر خوراک جو خود ایک چھٹانک خوراک ہضم نہیں کر سکتے، قوم کو کیا دیں گے۔ خیر شیخ رشید کہہ رہے تھے ہم نے آئین پاس کر دیا، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا فیصلہ اٹل ہے۔ بھٹو صاحب نے بات چیت کے بعد ہمارے سات مطالبات مان لیے، چار نہ مانے۔

چار میں سے ایک یہ تھا کہ دستور میں بنیادی حقوق کی دفعات میں یہ حق بھی شامل کیا جائے کہ عوام عدالت کے ذریعے روٹی، کپڑا، مکان وصول کر سکیں۔ بھٹو نے کہا، میں یہ چیزیں کہاں سے دوں گا؟ ہم نے کہا، آپ نے نعرہ کیوں لگایا؟ کہا، نعرہ تو لگایا مگر کروڑوں کو کیسے دوں۔ روٹی، کپڑا اور مکان؟ ہم نے کہا یہ دفعہ ۵ سال تک نافذ نہ ہوگی۔ پانچ سال بعد خود بخود نافذ سمجھی جائے گی۔ کہا یہ پانچ سال بعد کیسے دے دوں گا؟ ہم نے کہا دس سال بعد اس پر بھی نہ مانے، پندرہ سال پر بھی نہ مانے۔ پنجاب کے لوگو! جس نعرے پر آپ سے ووٹ لیے گئے اس

کو عملی صورت دینے سے انکار کر دیا بھٹو صاحب نے۔ تو بات ہو رہی تھی ترمیم کی۔ ہم اسمبلی میں گئے، تو پیرزادہ صاحب آئے۔ آئین میں ترمیمیں پیش کیں جو پاس ہو گئیں اور شیخ رشید کے چیلنج دھرے کے دھرے رہ گئے۔

سب سے پہلے ہم نے مطالبہ کیا کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہو، ختم نبوت کا مسئلہ رکھوایا۔ بھٹو صاحب کہتے ہیں، یہ مسئلہ میں نے حل کیا۔ یار لوگ انہیں محافظ ختم نبوت بھی کہتے ہیں درحقیقت یہ مسئلہ ہم نے حل کرایا۔ دیکھیں! ایک آمر جس سے قوم مطالبہ کرتی ہے اگر قوم کے سامنے جھک جائے تو سہرا اس کے سر ہے یا قوم کے؟ (آوازیں! قوم کے سر ہے) برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر ائیلی نے آزادی کا مطالبہ مان کر ۱۴ اگست کو آزادی کا اعلان کیا۔ اس کا سہرا ائیلی کے سر ہے یا قوم کے؟ اگر آزادی کا سہرا ائیلی کے سر ہے، تو ختم نبوت کا مسئلہ طے کرنے کا سہرا بھی بھٹو صاحب کے سر ہے۔ الجزائر کے آٹھ لاکھ انسان فرانس کے مقابلے میں سینہ سپر ہوتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ڈیگال آزادی دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ تو کیا ڈیگال نے آزادی دی؟ (آوازیں: ''نہیں جی'')

بھٹو خاں نے قوم کے سامنے جھک کر مطالبہ مان لیا ہے اور کہتا ہے، سہرا میرے سر ہے۔ اسلامی آئین کے نفاذ میں بہر حال اپوزیشن کا بہت بڑا کردار ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آئین کے نفاذ کے بعد اسلامی قوانین کی عملی صورت بھی نظر آئی (آواز: ہم نے تو نہیں دیکھی) پھر کس منہ سے دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین نافذ کیے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ حکومت ہمارے حوالے کرو، اگر چھ ماہ میں مکمل طور پر اسلامی نظام نافذ نہ کر دیں، تو ہمیں پھانسی پر لٹکا دو (نعرے: ''انقلاب انقلاب، اسلامی انقلاب، قائد انقلاب مفتی اعظم مفتی اعظم)

شرعی عدالتیں:

بھائیو! میں نعروں سے دھوکہ دینے والا نہیں ہوں۔ میں سب جانتا ہوں ہاں تو ہم ان

سے مایوس ہو گئے ہیں۔ ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ نظام شریعت کانفرنس ایسے وقت میں بلائی گئی ہے، جب عوام موجودہ حکومت سے مایوس ہو چکے ہیں، وہ جان چکے ہیں ان تلوں میں تیل نہیں۔ اس لیے میں آج اس کنونشن میں اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں اس کا فیصلہ مجلس شوریٰ نے کیا ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں ملک بھر میں شرعی عدالتیں قائم کرنے کا (فلک شگاف نعرے)

''اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے مسلمانوں کے تمام مقدمات و معاملات طے کرنے کے لیے شرعی عدالتیں قائم کرنے کا اعلان کرتا ہوں، ہر ضلع میں عدالت شرعی قائم کی جائے گی۔ صوبے میں بھی اور مرکز میں بھی۔ مرکز میں تین جج ہوں گے جو صوبے کے بورڈ (قاضیوں) کا انتخاب کریں گے۔ اس کے بعد ہر ضلع میں شرعی عدالتوں کی نامزدگی ہوگی۔ ہم دعوت دیں گے مسلمانوں کو کہ اپنے مقدمات ان عدالتوں میں لاؤ۔ جب تک کہ حکومت شرعی عدالتیں قائم نہیں کرتی۔ (نعرے)

جو مقدمہ قابل دست اندازی پولیس نہیں، جن میں سرکار ملوث نہ ہو (اس وقت گیارہ بجنے میں پانچ منٹ ہیں، بجلی بند ہو جاتی ہے۔ نعرے لگ رہے ہیں: واپڈا مردہ باد، جنریٹر کے انتظام کی وجہ سے لاؤڈ سپیکر اور روشنی کا نظام بحال ہو جاتا ہے) ان مقدمات کے فیصلے شرعی عدالتوں سے کراؤ، فیصلے کی اپیل صوبے میں ہو سکے گی اور صوبے کی مرکز میں۔ اگر معاملات شریعت کے مطابق طے ہو سکیں تو غیر اسلامی قانون کی ضرورت؟ قرآن کریم میں واضح الفاظ میں آیا ہے۔ کہ اے نبی یہ مومن نہیں جب تک آپ کو عدالتی معاملات میں حاکم نہیں تسلیم کرتے تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے مقدمات ان شرعی عدالتوں میں لائیں۔

مرکز میں جن تین قاضیوں کی قاضی القضاۃ کی نامزدگی آج شوریٰ نے کی وہ ہیں۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان گوجرانوالہ، حضرت مولانا عبدالکریم صاحب بیر شریف (سندھ) والے اور تیسرا میرا نام (مولانا مفتی محمود) بہت جلد ملک بھر میں ہر ضلع میں عدالتیں قائم ہو جائیں گی۔

اگر اسلام کے احکام کے مطابق یہاں حدود و قصاص نافذ ہو جائیں تو معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی۔ آپ نے دیکھا شاہ فیصل کو اپنے بھتیجے نے شہید کیا۔ قاتل شہزادہ تھا،

شاہی خاندان کا فرد مگر اسلامی قانون کے سامنے اس کو بھی سر جھکانا پڑا - جلاد نے اس کی گردن کاٹ کر رکھ دی - اگر یہی نظام یہاں لایا جائے تو قتل و غارت رک جائے گی - اگر ایک چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور گوجرانوالہ کے بازار یا شیرانوالہ گیٹ میں لٹکا دیا جائے تو پھر چوری نہ ہوگی - میں دعوے سے کہتا ہوں، انشاءاللہ دوسرا ہاتھ کٹنے کی نوبت نہ آئے گی - حضورؐ پرنور کے پورے دور میں صرف ایک ہاتھ کٹا -

پھر یہ نہ ہوگا:

بنومقصوم قبیلے کی ایک عورت فاطمہ نامی نے چوری کی - قبیلے والوں نے کہا اگر اس کا ہاتھ کٹ جائے تو پورے قبیلے کی ناک کٹ جائے گی - حضرت اسامہ بن زید کو سفارش بنا کر حضورؐ کی خدمت میں لے گئے - اسامہؓ نے عرض کیا تو حضورؐ نے غصے میں فرمایا - اے اسامہ! اللہ کے نظام کے خلاف سفارش کرتے ہو - اگر محمد کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی، تو خدا کی قسم اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا - تو بھائیو! اگر حدود قائم ہو جائیں، تو پاکستان میں بھی چوری، بدکاری اور قتل و غارت کا خاتمہ ہو سکتا ہے -

بھٹو صاحب کہتے ہیں میری پارٹی میں چور گھس آئے، میری پارٹی میں سمگلر آ گئے، میری پارٹی میں بلیک میلر آ گئے - (ایک آواز: ڈاکو اور جیب تراش بھی) وہاں وہ بھی آ گئے اور تم اس پارٹی کے چیئرمین صاحب بھی ہو (قہقہہ) تو اسلامی نظام آ گیا، تو یہ نہ ہوگا - (نعرے: ''پاکستان کا چاند ستارا - مفتی ہمارا، مفتی ہمارا)

ہم خدا کے گھر میں عہد کرتے ہیں کہ اپنی جانیں، عزت و آبرو سب کچھ اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے قربان کر دیں گے - اس اعلان کے بعد آپ آرام سے نہ بیٹھیں - کنونشن کے اس فیصلے کو گھر گھر پہنچائیں (آواز: ''انشاءاللہ، انشاءاللہ) شرعی عدالتوں سے فیصلے کرانے کا پیغام جگہ جگہ پہنچا دیں -

و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

مولانا مفتی محمود...... درویش سیاست دان

مولانا مفتی محمود کو ہم سے جدا ہوئے ۱۷ برس بیت گئے ہیں۔ لیکن ان کی دینی خدمات اور ”سیاسی فتوحات“ آج بھی زندہ ہیں کہ انہوں نے ”وقت کے آمر“ سے نہ صرف ٹکر لی بلکہ فاتح بھی قرار پائے۔ ضرورت ہے کہ نئی نسل کو ایسے محسنوں سے متعارف کرایا جائے کہ آج کی جدید دنیا میں جب منصب و دولت کی دوڑ لگی ہوئی ہے مولانا مفتی محمود پہلے سیاست دان تھے جنہوں نے اقتدار کو ٹھوکر ماردی جبکہ لوگ وزارت کے لیے ”ہارس ٹریڈنگ“ ہی نہیں سیاسی وفاداریاں بھی تبدیل کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ اس وقت کے حکمران ذوالفقار علی بھٹو نے جب بلوچستان میں سردار عطاء اللہ مینگل کی منتخب مخلوط حکومت کو جبراً برخاست کیا تو اس غیر جمہوری اور غیر قانونی اقدام پر بھرپور احتجاج کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اگرچہ تمام تر مخالفت کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو چاہتے تھے کہ مولانا صاحب اس وقت استعفیٰ نہ دیں کہ اس طرح سیاسی بحران پیدا ہوگا اور ایسا ہی ہوا اگرچہ ظاہراً مرحوم بھٹو نے چھ سال سے زائد حکومت کی لیکن ”امن و چین“ سے حکمرانی نہیں کرسکے۔ یہی مولانا مفتی محمود تھے جو سیاست میں ان کا پیچھا کرتے رہے اس دور میں جمہوریت اور سیاست دانوں کے ساتھ کیا بیتی یہ ایک طویل اور افسوس ناک داستان ہے۔

مولانا مفتی محمود عالم دین، مدبر اور بڑے سیاست دان تھے۔ دنیاوی جاہ و جلال، لالچ و حرص ان کے قریب سے ہو کر نہیں گزری۔ ان کی زندگی کا اول و آخر مقصد ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ تھا۔ جس کے لیے وہ موت تک جدوجہد کرتے رہے اور سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے انہوں نے اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے کئی اقدامات کیے جو ایک ریکارڈ بھی ہیں۔ حلف اٹھانے کے بعد ان کا پہلا حکم صوبہ میں شراب پر مکمل پابندی تھا اور اس پر ملک میں

ہی نہیں عالم اسلام میں خیر مقدم کیا گیا۔ لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی نے ایک مراسلہ میں لکھا کہ "شراب پر پابندی کے بارے میں آپ کے جرأت مندانہ اقدام پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اسلامی اقدار کے احیاء اور بلندی کے لیے آپ کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔

دوسرا بڑا کام صوبہ سرحد میں اردو کو سرکاری زبان قرار دینا تھا کہ ایک حکم کے ذریعہ تمام سرکاری خط و کتابت اور کام اردو میں کر دیا گیا۔ ہر طرح کے جوئے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی اور دینی تعلیم رائج کرنے کے لیے بھی اقدام کیے گئے۔ پاکستان میں پہلی بار صوبہ کی حد تک کالج یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے قرآن ناظرہ پڑھا ہوا اور ترجمہ کے ساتھ نماز یاد ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ وہ صوبہ میں ایسا کرنے کا اختیار رکھتے تھے لیکن مرکز کی حکومت کو اس پر اعتراض تھا اس لیے اس وقت کے وفاقی وزراء کی باقاعدہ ڈیوٹیاں لگائی گئیں کہ وہ صوبہ سرحد میں جا کر مولانا مفتی محمود کے خلاف تقریریں کریں۔ لیکن مولانا صاحب نے ان وزیروں کو کھلی چھٹی دی ان کے نو ماہ کے دور میں ایک دن کے لیے دفعہ ۱۴۴ نہیں لگی۔ ایک سیاسی شخص نظر بند یا قید نہیں ہوا، نہ ہی کسی کے خلاف مقدمہ درج ہوا۔ بعد میں وہ قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد منتخب ہوئے اور جب ملک کی سیاسی جماعتوں نے متحد ہو کر اس وقت کی حکومت کے خلاف عام انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو ۹ جماعتی پاکستان قومی اتحاد کی سربراہی مولانا مفتی محمود کے سپرد کی گئی کہ وہ ایک قدآور دینی و سیاسی قائد تھے اور عام انتخابات میں دھاندلی کے خلاف تحریک جو تحریک نظام مصطفیٰ کہلائی اس کی قیادت بھی کی۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جب مرحوم جنرل ضیاء الحق نے قومی اتحاد سے تعاون و اشتراک کی پیش کش کی تو قومی اتحاد نے مشروط طور پر پیشکش قبول کی کہ جنرل صاحب اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کریں۔ مرحوم جنرل ضیاء الحق نے اسلامی حدود و تعزیرات نافذ کرنے کا اعلان کیا اور اسلامی نظام کے نفاذ کا وعدہ کیا تاہم جمعیت علمائے پاکستان اور تحریک استقلال نے قومی حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ لیکن ۹۰ دن میں نہ ہی انتخابات کرائے گئے نہ ہی قومی اتحاد سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا گیا اور قومی اتحاد حکومت سے باہر نکل آئی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موت سے قبل مولانا مفتی محمود کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ مارشل لاء کی حمایت ان کی ”سنگین غلطی“ تھا اس کا نجی محفلوں میں اظہار بھی کیا کرتے تھے- انتقال سے چند روز قبل لاہور آئے اور جامع مسجد شیرانوالہ میں نماز جمعہ کی امامت کی اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے یہ واقعہ سنایا کہ سرحد کے گورنر جنرل فضل حق میرے پرانے ملنے والے ہیں- وہ میرے پاس صدر ضیاء الحق سے ملاقات کا پیغام لے کر آئے- میں نے کہا کہ میں ان سے نہیں ملتا انہوں نے وعدہ خلافی کی ہے- فضل حق صاحب کہنے لگے کہ دیکھیے مولانا صاحب جنرل ضیاء الحق اسلام کی بات تو کرتے ہیں خود نماز بھی پڑھتے ہیں- میں نے کہا کہ ہاں یہ درست ہے انہوں نے ساری قوم کو گٹر میں پھینک دیا ہے اور ڈھکنا رکھ کر اس پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی ہے- آپ درست کہتے ہیں کہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور تقریر میں عوام سے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ان طاقتوں کے خلاف میدان عمل میں نکل آئیں جو ملک میں اسلام اور اسلامی اقدار کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں- مولانا ذیابیطس کے پرانے مریض تھے لیکن ڈاکٹروں کے اصرار کے باوجود پرہیز نہیں کرتے تھے- اس لیے مرض میں اضافہ ہوتا گیا وہ حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے لاہور سے کراچی پہنچے اور ۱۴ اکتوبر کو جہان فانی سے رخصت ہو گئے- یہ بھی پکی اور سچی بات ہے کہ مولانا مفتی محمود نے اس وقت کے حکمرانوں کے خلاف تحریک چلانے کا اصولی فیصلہ کر لیا تھا- وہ ان ”بڑے لوگوں“ میں شامل ہیں جن کے نام ”اچھے کام“ زیادہ ہیں کہ ان کی موت سے دینی خدمت اور ملکی سیاست میں جو خلا پیدا ہوا تھا اسے ابھی تک پر نہیں کیا جا سکا-

ایسا کہاں سے لائیں کہ تم سا کہیں جسے

(کالم-قلم کی آواز)
سید انور قدوائی

ایک غیر معمولی خط — ایک تاریخی دستاویز

یہ خط جس کا اردو ترجمہ انہی صفحات میں شائع کیا جارہا ہے مولانا مفتی محمود نے پاکستان قومی اتحاد کے صدر کی حیثیت سے سہالہ کیمپ جیل میں نظر بندی کے دوران لکھا تھا۔ مفتی صاحب اگرچہ نظر بند تھے لیکن پوری قوم کے دلوں پر انہی کی حکومت تھی اور ان کا مخاطب ملک کا انتظامی سربراہ ہونے کے باوجود وزیر اعظم ہاؤس میں بند رہنے پر مجبور تھا۔

جیسا کہ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان قومی اتحاد اور حکمران گروہ کے مابین تلخی اور کشیدگی نے ایسی شدت اختیار کر لی تھی کہ فرمانروائے سعودی عرب خادم حرمین شریفین شاہ خالد بن عبدالعزیز کو مداخلت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ پاکستان میں سعودی عرب کے اس وقت کے سفیر جناب ریاض الخطیب نے جلالۃ الملک خالد بن عبدالعزیز کی نمائندگی کرتے ہوئے فریقین سے گفتگو کی اور انہیں مذاکرات کے ذریعہ متنازعہ امور طے کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ خط اسی سلسلہ میں مذاکرات کے پس منظر سے تعلق رکھتا ہے۔

ابتدائی گفتگو میں یہ طے ہوا تھا کہ مذاکرات کسی پیشگی شرط کے بغیر شروع کیے جائیں گے۔ اس لیے کسی بھی فریق سے کسی قسم کی تحریر حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ راقم الحروف کو یہ بات خود حضرت مولانا مفتی محمود نے نظر بندی کے دوران سہالہ کیمپ جیل میں بتائی۔ یہ ملاقات ۲۰ مئی ۱۹۷۷ء بروز جمعۃ المبارک دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک ہوئی۔ نواب زادہ نصراللہ خاں بھی موجود تھے۔ ملاقات کا اہتمام متعلقہ حکام کی باضابطہ منظوری

سے کیا گیا- مجھے دراصل کسی دوست کے ذریعہ حضرت مولانا مفتی محمود نے راولپنڈی پہنچنے کے لیے پیغام بھیجا تھا تا کہ میں ان سے سہالہ کیمپ جیل میں ملاقات کر سکوں- مسٹر بھٹو کو اعتماد میں لیے بغیر یہ ملاقات کسی بھی صورت ممکن نہ تھی اور تحریک کے دوران روزنامہ ''وفاق'' کے تاریخی کردار کے باعث بھٹو کا مجھ پر اعتماد اگرچہ ختم ہو چکا تھا لیکن اس ملاقات کا راستہ نکل ہی آیا-

مفتی محمود صاحب کے اس انکشاف پر کہ سعودی عرب کی براہ راست مداخلت کے بعد قومی اتحاد کی طرف سے مذاکرات کے لیے آمادگی ظاہر کر دی گئی ہے اور مذاکرات کے لیے پیشگی شرط بھی کوئی عائد نہیں کی گئی- میں نے بصد ادب واحترام عرض کیا کہ فریقین کو اپنی اپنی طرف سے ایسی تحریر سعودی عرب کے سفیر جناب ریاض الخطیب کے حوالے کر دینی چاہیے جسے پیشگی شرط کی حیثیت تو حاصل نہیں ہوگی لیکن مذاکرات کے لیے رضامندی کا اظہار ضرور ہوگا- مفتی صاحب نے مجھے بتایا کہ جناب ریاض الخطیب سب سے پہلے مسٹر بھٹو سے ملے ہیں اور ان کے بقول مسٹر بھٹو نے قومی اسمبلی توڑنے اور نئے انتخابات کرانے کی یقین دہانی کرائی ہے بشرطیکہ ہم لوگ کسی پیشگی شرط کے بغیر مذاکرات کے لیے تیار ہو جائیں-

ان دنوں عوام میں ہیجان واضطراب کا یہ عالم تھا کہ وہ مسٹر بھٹو کو وزیراعظم تسلیم کرنے اور اس حیثیت میں ان سے مذاکرات کو ناقابل برداشت تصور کرتے تھے- لیکن مذاکرات کی تحریک چونکہ سعودی عرب کی طرف سے کی گئی تھی اور یہ تاثر عام ہو چکا تھا کہ اب تو مکہ مدینہ درمیان میں آ گیا ہے- چنانچہ پاکستان قومی اتحاد کے نظر بند رہنماؤں کو بھی اسی وجہ سے مذاکرات پر آمادہ ہونے کا حوصلہ ہوا لیکن اس کے باوجود انہیں یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرانے کا وعدہ شاید پورا نہیں کیا جائے گا- میں نے احتیاط کے تقاضوں کے پیش نظر مفتی صاحب کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ سعودی حکومت کے اپنے وقار کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ سے بھی یہ تحریر لے کہ آپ کسی پیشگی شرط کے بغیر مذاکرات کے لیے جا رہے ہیں اور مسٹر بھٹو سے بھی یہ تحریری ضمانت حاصل کرے کہ وہ مذاکرات شروع ہوتے ہی قومی اسمبلی توڑنے

اور نئے انتخابات کے لیے تاریخوں کا اعلان کریں گے۔ مفتی صاحب نے میرے اس موقف کو نہ صرف درست تسلیم کیا بلکہ پسند بھی کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں سعودی عرب کے سفیر جناب ریاض الخطیب سے ملاقات کر کے ان کے سامنے اپنے اس موقف کی وضاحت کروں چنانچہ میں نے اسی شام جناب ریاض الخطیب کی قیام گاہ پر حاضری دی اور ان سے تفصیلی گفتگو کی۔ جناب ریاض الخطیب سے اگرچہ یہ میری پہلی تفصیلی ملاقات تھی لیکن ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قومی سطح پر سیاسی اختلافات ختم کرانے کے لیے میرے کردار سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھرپور اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ ولی عہد شہزادہ فہد میری رپورٹ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ میرے پاس ہرگز اتنا وقت نہیں ہے کہ میں اب فریقین سے تحریری ضمانتیں حاصل کروں۔ یوں بھی ایسی تحریریں حاصل کرنا پیشگی شرط کی تعریف میں آتا ہے اور یہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ مذاکرات کسی پیشگی شرط کے بغیر ہوں گے۔

میں نے قدرے تامل کے ساتھ اپنا موقف پھر دہرایا اور سعودی سفیر سے گزارش کی کہ آپ کا اور آپ کی حکومت کا عمل دخل غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے ہمارے سیاسی رہنماؤں میں سے کسی نے کسی بھی مرحلہ پر آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ تو یہ کسی طرح بھی اچھا نہیں ہوگا۔ حکمت کا تقاضا یہی ہے اور اس وقت اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کہ آپ دونوں کی طرف سے تحریری ضمانت حاصل کر لیں۔ اس پر جناب ریاض الخطیب کو قدرے کوفت ہوئی اور انہوں نے کہا کہ انتیس سالہ سفارتی تجربہ اس قسم کی کسی تحریر لینے میں مانع ہے۔ اگر کسی فریق نے وعدہ خلافی کی تو میں قرآن ہاتھ میں لے کر عوام کے سامنے آ جاؤں گا اور صاف صاف بتا دوں گا کہ کون سے فریق نے کیا وعدہ خلافی کی ہے۔

اس کے بعد میرے لیے سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہ تھا پاکستان کے حق میں دعائے خیر کے بعد ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

اس دوران سردار محمد عبدالقیوم خصوصی طیارے کے ذریعہ پاکستان قومی اتحاد کے مختلف

سیاسی رہنماؤں سے مختلف شہروں میں ملاقاتوں کے بعد راولپنڈی واپس آ چکے تھے اور انہوں نے مولانا مفتی محمود کو اپنی رپورٹ دے دی تھی۔ ادھر مجھے بھی ۲۵ مئی کو مسٹر بھٹو سے ایک ملاقات کا موقع ملا جو شام سات بجے سے پونے آٹھ بجے تک جاری رہی۔ مسٹر بھٹو ان دنوں خفگی اور برہمی کی انتہاؤں کو چھو رہے تھے۔ چنانچہ شدید غصے کے عالم میں انہوں نے کہا ایک تو مخلوط حکومت نہیں مانوں گا دوسرے جلد انتخابات ممکن نہیں۔ یہ دونوں باتیں مجھے اس لیے بتائی گئی تھیں کہ میں سہالہ کیمپ کے نظر بند سیاسی رہنماؤں تک ان کی رائے پہنچا دوں۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ مخلوط حکومت سے انہیں بھی کوئی دلچسپی نہیں اور انتخابات جلد کرانے پر وہ بہرحال اصرار کریں گے۔ تاہم مسٹر بھٹو کا یہ موقف ان تک پہنچا دیا گیا۔ اس سے پہلے خود مسٹر بھٹو بھی ۱۸ مئی کو مولانا مفتی محمود سے سہالہ کیمپ جیل میں ملاقات کر چکے تھے۔ عبدالحفیظ پیرزادہ، کوثر نیازی اور میر افضل خان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس ملاقات میں جو کچھ مجھے بتایا گیا صرف دو باتوں پر اتفاق ہوا تھا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اول قومی اتحاد کے رہنما کسی پیشگی شرط کے بغیر مذاکرات میں شریک ہوں گے دوم مذاکرات شروع ہوتے ہی مسٹر بھٹو قومی اسمبلی توڑنے اور نئے انتخابات کرانے کا اعلان کریں گے۔ اس ملاقات کے بعد ہی سردار عبدالقیوم کو پاکستان کے مختلف شہروں میں نظر بند قومی اتحاد کے رہنماؤں سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا تھا۔ تبادلہء خیال کی مشق مکمل ہونے کے بعد دوسرا دور شروع ہوا اور ۲۶ مئی کو خود مسٹر بھٹو نے سعودی سفیر جناب ریاض الخطیب سے یہ کہا کہ زبانی قول و قرار کافی نہیں مولانا مفتی محمود کی طرف سے ایسا خط آنا چاہیے کہ وہ مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔ اس سے سعودی سفیر قدرتی طور پر پریشان ہوئے انہوں نے پاکستان کے بعض صاحب درد بزرگوں کو اعتماد میں لیا اور اس صورت حال پر نئے سرے سے غور و فکر کیا لیکن انہیں یہی مشورہ دیا گیا کہ وہ بات آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ سعودی سفیر سہالہ کیمپ گئے اور سہالہ کیمپ میں مقیم سیاسی نظر بندوں سے بھٹو کے نام خط حاصل کرنے کا تقاضا کیا اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کے بعد بھٹو کے نام خط لکھنے کا فیصلہ

ہوا۔ اس دن مئی کی ۲۷ تاریخ تھی یہ وہی تاریخی خط ہے جس کا ذکر ابتدا میں کیا جا چکا ہے اور جس کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ہی دیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ اس خط کی فوٹو سٹیٹ نقل پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا اس کے دوسرے پیراگراف میں چند الفاظ کو نشان زد کیا گیا ہے۔ اسی طرح تیسرے پیراگراف میں چند الفاظ کو نشان لگا کر دوسرا لفظ لکھا گیا ہے اور آگے چل کر بعض الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ پنسل کے یہ نشان اور اضافہ خود مسٹر بھٹو نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ خط کی عبارت مسٹر ارشد چودھری کی تحریر کردہ ہے اور اس پر دستخط حضرت مولانا مفتی محمود کے ہیں۔ خط کے مضمون میں نواب زادہ نصر اللہ خاں بھی شریک مشورہ تھے۔

اس خط کے مطالعہ کے بعد مسٹر بھٹو اس میں جو بنیادی تبدیلی چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ مولانا مفتی محمود اپنی طرف سے لکھیں کہ ''مسٹر بھٹو نے اسمبلی توڑنے کی واضح یقین دہانی کرائی بشرطیکہ دوسرے متعلقہ امور بھی متفقہ فیصلہ کے مطابق طے پا جائیں۔ لیکن اصل خط اس طرح تھا ''مسٹر بھٹو نے اسمبلی توڑنے کی واضح یقین دہانی کرائی اور اس امر کی ذمہ داری بھی لی کہ انتخابات کرانے کے انتظامات بھی حکومت اور قومی اتحاد کے نمائندوں کے مابین دوسرے امور کے تصفیہ کے وقت طے کر لیے جائیں گے۔ خط میں یہ حوالہ اس گفتگو سے تعلق رکھتا ہے جو ۱۸ مئی کو سہالہ کیمپ میں فریقین کے مابین ہوئی تھی۔

مفتی صاحب کے خط کے متن میں بعض لفظی ترمیموں پر اکتفا کرنے کے بجائے بھٹو نے اپنی طرف سے ایک جملہ تین مختلف شکلوں میں لکھ کر خط کے ساتھ منسلک کر دیا۔ (یہ جملہ مفتی صاحب کے خط کے بعد شروع ہوتا ہے اس جملے کی تینوں مختلف شکلوں کا ترجمہ بھی خط کے متن کے ترجمے کے ساتھ دیا جا رہا ہے جس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ بھٹو ۱۸ مئی کو سہالہ میں کیے گئے وعدہ کی کوئی ایسی توجیہ کرنا چاہتے تھے کہ انہیں قومی اسمبلی توڑنے اور نئے انتخابات کے لیے تاریخ مقرر کرنے سے فرار کی راہ اختیار کرنے کا موقع مل سکے۔

مفتی محمود کے خط میں بھٹو کی مجوزہ ترمیم مفتی صاحب کو سخت ناگوار گزری اور انہوں نے

جناب ریاض الخطیب کو صاف صاف بتا دیا کہ ''ہمارا خط'' ہمارا خط ہے- اس کا جواب تو دیا جا سکتا ہے جس پر ہماری طرف سے غور بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے خط میں ایسی کسی قسم کی ترمیم کر کے یہ مطالبہ کرنا کہ ہم اس قسم کا خط لکھیں یہ کیسے ممکن ہے ہم کسی سے املا (Dictation) لیں۔''

تاہم مولانا مفتی محمود نے جناب ریاض الخطیب کی دل آزاری نہیں کی اور انہیں بتا دیا کہ ہم آپ کے کہنے پر اور آپ کے درمیان میں آنے پر پہلے ہی بڑی مشکل سے مذاکرات کے لیے آمادہ ہوئے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال کو بگاڑا جا رہا ہے ہم مزید وقت ضائع کرنے کو تیار نہیں ہیں-

سعودی سفیر ریاض الخطیب اپنی پیرانہ سالی کے باعث اس بحث و تمحیص میں پریشان تو ضرور ہوئے لیکن پاکستان کی سلامتی اور اس کے استحکام کا درد اور اس کے ساتھ شاہ خالد بن عبدالعزیز کی شدید خواہش کہ مصالحت کا راستہ نکلنا چاہیے- یہ ساری چیزیں انہیں مجبور کر رہی تھیں کہ وہ ہر ممکن کوشش کر کے فریقین کے درمیان مذاکرات کا اہتمام کریں- چنانچہ ۲۴ گھنٹوں کے دوران موصوف نے سہالہ اور وزیراعظم ہاؤس کے تین چکر لگائے اس دوران میں یہ افواہیں بھی گشت کرنے لگیں کہ پاکستان میں ہنگامی حالات کا اعلان کیا جانے والا ہے- بے چینی اور اضطراب پہلے ہی کچھ کم نہ تھا اس تعطل کی کیفیت نے اس میں اور بھی اضافہ کر دیا-

سہالہ کیمپ میں مفتی صاحب سے جناب ریاض الخطیب کی آخری ملاقات میں یہ طے ہوا کہ مسٹر بھٹو یا تو ہمارے اصل خط کو وصول کر کے اس کا جواب دیں یا اپنی تجاویز خود لکھ کر بھیجیں ہم ان کا جواب دیں گے یا پھر سعودی سفیر کی ضمانت کو فریقین کافی سمجھیں اور کسی بھی قسم کی مداخلت نہ کی جائے- چنانچہ اس کے بعد جب سعودی سفیر مسٹر بھٹو سے ملے تو انہوں نے اپنے قریبی رفقاء سے مشورہ کے بعد آخری بات مان لی- گویا وہی پہلی بات جو شروع میں طے کی گئی تھی کہ نہ ادھر سے کوئی تحریک آئے نہ ادھر سے کوئی تحریری یقین دہانی کرائی جائے-

اس موقع پر اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ اخبارات کے نمائندوں نے ایک مرحلہ پر

سعودی سفیر سے استفسار کیا کہ آپ سہالہ سے کوئی خط لائے ہیں تو اس ماہر ڈپلومیٹ نے جواب دیا میں نے کوئی خط بھٹو کے حوالے نہیں کیا- اس طرح سعودی سفیر نے کوئی غلط بیانی نہیں کی اس لیے کہ ایک خط ایک سے زائد مرتبہ سہالہ سے آیا اور بھٹو تک پہنچا مگر اسے سرکاری طور پر وصول نہیں کیا گیا یہ ہے اس خط کی کہانی جو پاکستان کے سرکاری ریکارڈ میں تو جگہ نہ پا سکا تاہم اس دور کی سیاسی تاریخ کے اہم ترین واقعہ کا تعلق اس خط کے مندرجات سے ہے جس کے مطالعہ سے بیشتر حقائق ازخود واضح ہو جاتے ہیں-

مصطفیٰ صادق

سہالہ کیمپ جیل
۲۷ مئی ۱۹۷۷ء

ڈیئر مسٹر بھٹو!

جیسا کہ یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ میں نے اپنے خط مورخہ ۱۲ مئی میں تحریر کیا تھا کہ پاکستان قومی اتحاد کے بنیادی مطالبہ کے ضمن میں آپ کی حکومت کے واضح اور مثبت رویہ کے بغیر ہمارے لیے مذاکرات جاری رکھنا مشکل ہو گیا ہے- ۸ مارچ کے بعد پاکستان کے عوام نے اپنی قومی تحریک کے دوران بے مثال قربانیاں دی ہیں- انہوں نے بے پناہ سختیاں برداشت کی ہیں-- جس کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ جب تک آپ کی جانب سے قومی اسمبلی کے از سر نو انتخابات کرانے کی حتمی یقین دہانی نہیں کرائی جاتی اس وقت تک موجودہ فضا کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے- کیونکہ اس کے بغیر عوام کو کسی طرح بھی مطمئن نہیں کیا جا سکتا- اس کے بعد ۲۳ مئی کو نصف شب کے وقت میرے ساتھیوں کو دور دراز مقامات پر پہنچا دیا گیا- نیز انہیں بطور سزا جیلوں اور حوالاتوں میں بند کر دیا گیا-

۱۷ مئی کو سعودی عرب کے سفیر السید ریاض الخطیب میرے پاس تشریف لائے اور (سعودی فرمانروا) جلالۃ الملک شاہ خالد کی اس خواہش کا اظہار کیا کہ پاکستان کی سالمیت اور عالم اسلام کے وسیع تر مفاد میں کسی فیصلہ پر پہنچنے کی خاطر از سر نو کوشش کی جائے- سعودی سفیر نے یہ تاثر بھی دیا کہ آپ نے ہمارے اس مطالبہ کے ضمن میں زیادہ حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے کہ قومی اسمبلی توڑ دی جائے اور نئے انتخابات کرائے جائیں- نیز آپ کی خواہش ہے کہ محض جزوی نوعیت کا اعلان کرنے کی بجائے تمام معاملات ایک تفصیلی اور جامع معاہدہ کی صورت میں طے کیے جائیں-

۱۸ مئی کو میرے ساتھیوں میں سے دو نوابزادہ نصر اللہ خاں اور سردار عبدالقیوم خاں کو سہالہ پہنچایا گیا- اسی دن آپ بھی اپنے تین وزراء مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ مولانا کوثر نیازی اور میر افضل خاں کے ساتھ سہالہ پہنچے اور غیر مبہم الفاظ میں کھلے طور پر قومی اسمبلی توڑنے پر آمادگی ظاہر کی اور یہ بھی کہا کہ نئے انتخابات کے انتظامات اور دیگر متفقہ امور کو حکومت اور پاکستان

قومی اتحاد کے درمیان جامع معاہدہ کی صورت میں طے کیا جائے گا۔

لیکن میں نے آپ کو اس موقع پر بتا دیا تھا کہ جب تک ہمارے ان تمام ساتھیوں سے بھی مشورہ نہیں کر لیا جاتا جو ملک کی مختلف جیلوں میں نظر بند رکھے گئے ہیں اس وقت تک میں آپ کو حتمی جواب نہیں دے سکتا۔ جس کے نتیجہ میں آپ سردار عبدالقیوم خاں کو رہا کرنے پر متفق ہو گئے اور اس پر بھی کہ وہ میرے دیگر ساتھیوں کے ساتھ رابطہ قائم کریں۔ سردار عبدالقیوم ۱۹ مئی کو رہا کیے گئے اور اسی شام وہ کراچی گئے۔ انہوں نے گڑھی خیرو میں مولانا شاہ احمد نورانی سے پروفیسر غفور احمد سے دادو میں اور ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں سے ساہیوال جیل میں ملاقات کی چند روز بعد سردار عبدالقیوم کی جناب اشرف خاں سے راولپنڈی میں بیگم نسیم ولی خاں کے ساتھ خانپور میں سردار شیر باز مزاری کے ساتھ میانوالی میں میاں طفیل محمد کے ساتھ بہاولپور میں ملاقات کا اہتمام کیا گیا جس کے بعد وہ ۲۵ مئی کی شام کو میرے پاس واپس پہنچے۔

۲۶ مئی کو سعودی سفیر سہالہ تشریف لائے تو ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ آپ تک ہمارا یہ پیغام پہنچا دیں کہ آپ کی یقین دہانیوں کے پیش نظر ہم آپ کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار ہیں ہم نے بعض تجاویز بھی پیش کیں جن کے ذریعے مذاکرات کے لیے مناسب فضا پیدا کی جا سکتی تھی۔ یہ تجاویز وہی ہیں جنہیں وقتاً فوقتاً آپ تک پہنچایا جاتا رہا ہے اور آپ انہیں قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر چکے ہیں۔ میں ایک بار پھر یہ تجاویز اس خط کے ساتھ منسلک کر کے آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

جیسا کہ پاکستان قومی اتحاد کی جانب سے مذاکرات کے لیے ایک تین رکنی ٹیم نامزد کی جا چکی ہے۔ اس کے ایک رکن پروفیسر غفور احمد ابھی تک سہالہ پہنچ کر ہمارے ساتھ شامل نہیں ہوئے۔

اور اب یہ صرف آپ پر ہی منحصر ہے کہ سیاسی تصفیے کے لیے آپ کب مذاکرات شروع کرنا چاہتے ہیں۔

آپ کا خیر خواہ
مفتی محمود

صدر پاکستان قومی اتحاد

مذاکرات کے لیے
مناسب ماحول تیار کرنے کی خاطر تجاویز

۱۔ اس تحریک کے دوران گرفتار کیے جانے والے تمام افراد رہا کر دیے جائیں۔ ان کے خلاف تمام مقدمات واپس لے لیے جائیں یا کم از کم اس ضمن میں حکومت کی جانب سے واضح اور باضابطہ اعلان کیا جائے۔ نیز مزید گرفتاریاں فوری طور پر روک دی جائیں۔

۲۔ حکومت یہ اعلان کرے کہ اس تحریک میں جاں بحق اور زخمی ہونے والوں کے خاندانوں کو مالی امداد فراہم کی جائے گی۔

۳۔ کراچی، لاہور، حیدرآباد اور دیگر شہروں سے مارشل لاء اٹھالیا جائے۔

۴۔ پاکستان قومی اتحاد کے تمام مرکزی رہنماؤں کو رہا کیا جائے تاکہ وہ مذاکرات کے دوران باہمی صلاح مشورہ کر سکیں۔ نیز یہ کہ وہ مذاکرات میں شریک اپنے ساتھیوں کی امداد و اعانت کر سکیں۔

۵۔ مذاکرات کے دوران مسٹر بھٹو اور ان کے تمام ساتھی اس تحریک اور اس کے مقاصد کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ کرنے سے باز رہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات پاکستان قومی اتحاد اور اس تحریک کے خلاف مہم ختم کر دیں۔ جہاں تک پاکستان قومی اتحاد کا تعلق ہے تو اس کی جانب سے مذاکرات کے دوران کسی قسم کی احتجاج یا

ہڑتال کی اپیل نہیں کی جائے گی۔

٦- ہنگامی حالت کو فوری طور پر ختم کیا جائے یا کم از کم اس نوعیت کا اعلان کیا جائے کہ اسے مستقبل قریب میں ختم کر دیا جائے گا۔

۷- اخبارات پر ہر قسم کی سنسر شپ کی پابندیوں کو بلا تاخیر ختم کر دیا جائے۔

بھٹو کی متبادل تجویز

۱- یہ غیر مبہم اعلان کیا جائے کہ پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ جامع معاہدہ میں عام انتخابات کے انعقاد اور دیگر متعلقہ امور کے ساتھ ساتھ آپ قومی اسمبلی کو توڑنے پر آمادہ ہیں۔

۲- واضح الفاظ میں اعلان کیا جائے کہ پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ جامع معاہدہ میں قومی اسمبلی کو توڑنا نئے عام انتخابات اور دیگر متعلقہ امور شامل ہوں گے۔

۳- آپ یہ واضح اعلان کریں کہ آپ پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ ایک جامع معاہدہ کی خاطر قومی اسمبلی کو توڑنے، عام انتخابات از سرنو کرانے اور دیگر متعلقہ امور کو طے کرنے پر آمادہ ہوں گے۔

یہ متبادل تجاویز وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے جناب مفتی محمود کے خط کے ساتھ منسلک کی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ مولانا مرحوم اسے اپنے خط اور تجاویز میں شامل کر دیں۔ بھٹو مرحوم چاہتے تھے کہ مذاکرات سے قبل قومی و صوبائی اسمبلیاں توڑنے کا اعلان نہ کیا جائے بلکہ جو معاہدہ ہو اس میں یہ بات شامل کر دی جائے۔ متبادل تجاویز مرحوم بھٹو نے سعودی سفیر جناب ریاض الخطیب کے ہاتھ ارسال کی تھیں۔ قومی اتحاد نے انہیں نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ اس پر برہمی کا اظہار بھی کیا کہ بھٹو صاحب کون ہوتے ہیں مولانا مفتی محمود کے خط یا تجاویز میں ترمیم کرنے والے۔ جیسا کہ اپنے خط میں مولانا مفتی محمود نے واضح کر دیا اور سفیر محترم سے بھی کہا

کہ اگر بھٹو صاحب ایسا چاہتے ہیں تو وہ اپنی جانب سے تجاویز دیں لیکن جب مذاکرات کرنے کا فیصلہ ہوا تو یہ متبادل تجویز کسی نہ کسی صورت تسلیم کر لی گئی اور بھٹو مرحوم کی جانب سے اسمبلیاں توڑنے کا اعلان نہیں کیا گیا اور ایسا جناب ریاض الخطیب کی جانب سے واضع یقین دہانی پر کیا گیا تھا کہ بھٹو حکومت از سر نو انتخابات کرائے گی۔ سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ مرحوم بھٹو نے یہ تجویز تسلیم نہ کر کے سیاسی غلطی کی تھی۔ اگر وہ قومی اتحاد کی تجویز مان کر اسمبلیوں کو توڑنے کا اعلان کر دیتے تو مرحوم جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں کو مارشل لاء لگانے کا موقع نہ ملتا اور وہ کچھ نہ ہوتا جس کے نتیجہ میں نہ صرف ملک مارشل لاء سے دو چار ہوا بلکہ اس غلطی کا خمیازہ آج تک قوم بھگت رہی ہے کہ جمہوریت بحال نہیں ہو سکی اور مولانا مرحوم کے ایک ساتھی نوابزادہ نصر اللہ خان بحالی جمہوریت کے لیے آج بھی سرگرم عمل ہیں۔ یہ مولانا مرحوم کا مشن ہے جو جاری ہے۔

آخری دعوت...... آخری ملاقات

پیر ۱۳- اکتوبر ۱۹۸۰ء کی رات پیر صاحب پگاڑو نے مولانا مفتی محمود کے اعزاز میں عشائیہ دیا- جو مولانا مفتی محمود کی زندگی کی آخری دعوت تھی- پیر صاحب پگاڑو اور مولانا مفتی محمود کے درمیاں گہرے تعلقات تھے- قومی اتحاد کی تحریک میں پیر صاحب پگاڑو ان کے نہ صرف ہم سفر اور رفیق تھے بلکہ جب قومی اتحاد کے سارے رہنما قید ہو گئے تو پیر صاحب پگاڑو ہی تھے جنہوں نے تحریک نفاذ مصطفیٰ کو جاری رکھا- مرحوم بھٹو پیر صاحب پگاڑو سے خائف تھے یہی وجہ ہے کہ انہیں نظر بند کرنے کی جرأت نہیں کی- لانگ مارچ کے دوران جب اسلام آباد آنے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی تو پیر صاحب پگاڑو کسی طریقے سے اسلام آباد پہنچ گئے- جہاں انہیں ان کے ہوٹل میں نظر بند کر دیا گیا- جب یہ خبر سانگھڑ پہنچی تو ان کے مرید سڑکوں پر آ گئے- چنانچہ مرحوم بھٹو نے ڈرامہ کیا اور اچانک پیر صاحب پگاڑو کے کمرے میں جا پہنچے- ٹی وی والے ان کے ہمراہ تھے اور اس ملاقات کی خبر ٹیلی ویژن پر چلائی گئی تاکہ حروں کو یہ بتایا جا سکے کہ پیر صاحب پگاڑو قید نہیں ہیں- جب مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور دوسرے قومی اتحاد کے لیڈر سہالہ ریسٹ ہاؤس میں قید تھے تو پیر صاحب پگاڑو ان کا کھانا لے کر روز ریسٹ ہاؤس جاتے تھے اور واپس آ کر صحافیوں کو ان کی خیر خیریت بتاتے تھے- پیر صاحب پگاڑو کا ایک سیاسی قد اور مقام ہے لیکن یہ بات میرے ذاتی مشاہدہ میں ہے کہ وہ مولانا مفتی محمود کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کی سیاسی عظمت کے معترف تھے- ان کا کہنا

ہے کہ میں نے مفتی محمود جیسا مخلص، دیانتدار اور سچا شخص نہیں دیکھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ مولانا فضل الرحمٰن سے بڑا پیار کرتے ہیں اور پیار سے انہیں چھوٹے مفتی صاحب کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ مولانا مفتی محمود سے یہی تعلق تھا کہ جب انہیں ان کی کراچی آمد کا پتہ چلا تو ان کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا۔ میں نے کراچی فون کر کے ان سے پوچھا کہ گزشتہ رات قبلہ مفتی صاحب آپ کے مہمان تھے۔ کیا انہوں نے کسی تکلیف کا ذکر کیا۔ تو پیر صاحب پگاڑو نے بتایا کہ مولانا مفتی محمود بڑے صحت مند لگتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اب آپ تحریک چلانے کے لیے جوان ہو گئے ہیں۔ ”میں تو جوان ہی ہوں“ پیر صاحب پگاڑو نے کہا میں نے ذیابیطس کے بارے میں ان سے پوچھا تو کہنے لگے کہ اب کنٹرول میں ہے۔ میں بہت پرہیز کرنے لگا ہوں۔ ”میرے کھانے کے موقع پر انہوں نے تھوڑا سا حلوہ بھی کھایا جو میں نے ان کے لیے خاص طور پر پکوایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مولانا مفتی محمود نے بتایا تھا کہ میں پرسوں فریضہ حج ادا کرنے جا رہا ہوں واپس آ کر قومی اتحاد کی جماعتوں کا اجلاس بلاؤں گا تا کہ آئندہ لائحہ عمل طے کیا جا سکے۔ وہ بڑے خوش وخرم تھے۔ آج جب بوستان ہوتی نے فون کر کے مجھے ان کے انتقال کی خبر سنائی تو یقین نہیں آیا کہ رات کو مولانا بالکل ٹھیک تھے کسے معلوم تھا کہ گزشتہ رات میری ان سے ”آخری ملاقات“ اور ان کی یہ ”آخری دعوت“ تھی۔ پیر صاحب پگاڑو کا کہنا ہے کہ مفتی صاحب مرحوم نے مجھ سے یہ گلہ کیا کہ ضیاء الحق سے ہم دھوکہ کھا گئے۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ میں تو ضیاء الحق کا ساتھ دینے کے خلاف تھا جس پر مولانا مرحوم نے مجھ سے کہا کہ اب ہم مل کر تحریک چلائیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تو غیر مشروط ساتھ ہوں ”ماموں جان“ سے بھی بات کر لیں۔ اس پر مولانا مفتی محمود مسکرائے اور کہا کہ ”واپس آ کر سب سے بات کریں گے۔“ مولانا نورانی کو آپ نے راضی کرنا ہے۔

مولانا مفتی محمود کا مشن

مولانا مفتی محمود کی یہ کوشش اور خواہش تھی کہ اس وقت کے حکمرانوں کے خلاف ایک بار پھر رائے عامہ ہموار کی جائے کہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ مرحوم جنرل ضیاء الحق نے نہ صرف نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے وعدے سے انحراف کیا ہے بلکہ قومی اتحاد کی قیادت کو دھوکہ دیا ہے اور وقت مقررہ پر وعدہ کے مطابق الیکشن بھی نہیں کرائے جس کا انہوں نے قوم سے وعدہ کیا تھا۔ مولانا مفتی محمود اور ان کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ بھٹو حکومت سے قومی اتحاد کے مذاکرات کامیاب ہو گئے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ بھٹو مرحوم قومی و صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر از سر نو انتخابات کرانے کا اعلان کریں گے اور عبوری نگران حکومت میں دونوں پارٹیوں کے نمائندوں کو شریک کیا جائے گا لیکن ابھی معاہدہ پر دستخط ہونے والے تھے کہ مرحوم ضیاء الحق نے مارشل لا لگا دیا اور بھٹو حکومت کے خلاف عوامی نفرت سے نہ صرف فائدہ اٹھایا بلکہ قومی اتحاد کو بھی یہ عہد کر کے کہ اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا حکومت میں شریک اقتدار بھی کر لیا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی جب قومی اتحاد کو احساس ہوا کہ ان سے ہاتھ ہو گیا ہے تو قومی اتحاد کے وزراء استعفیٰ دے کر حکومت سے باہر آ گئے لیکن بعد میں مسلم لیگ وزارت میں شامل ہو گئی۔ جمعیت علماء پاکستان اور تحریک استقلال قومی اتحاد سے الگ ہو گئی۔ مولانا مفتی محمود اور ان کے ساتھیوں کی یہ کوشش تھی کہ ہم خیال سیاسی جماعتوں کو ایک بار پھر متحد کیا جائے۔ اس حوالے سے اپنی وفات سے قبل مولانا مفتی محمود نے اپنے مشن کو جاری رکھنے اور تحریک چلانے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ ان

کا کہنا تھا کہ ’’کوئی میرے ساتھ چلے یا نہ چلے میں تنہا ہی تحریک شروع کر دوں گا۔‘‘ انہوں نے اپنی موت سے دو روز قبل پیر صاحب پگاڑو سے اس بارے میں بات کی تھی۔ سردار شیر باز مزاری، پروفیسر غفور سے بھی مذاکرات ہوئے تھے اور نوابزادہ نصر اللہ بھی سرگرم تھے اور اصولی طور پر ملک میں بحالی جمہوریت کی تحریک چلانے کا فیصلہ ہو گیا تھا اور یہ بھی طے پایا تھا کہ پیپلز پارٹی کو بھی اس اتحاد میں شامل کیا جائے گا۔ ابتدائی طور پر اس نئے اتحاد کا ایک چارٹر بھی تیار کیا گیا جس پر مولانا مرحوم کے دستخط بھی تھے اور ان کی وفات کے بعد تحریک بحالی جمہوریت ایم آر ڈی کے نام سے ایک سیاسی اتحاد قائم کیا گیا جس کے پہلے سربراہ سردار عبدالقیوم تھے جس میں مسلم لیگ (خیر الدین گروپ)، تحریک استقلال پاکستان جمہوری پارٹی، عوامی نیشنل پارٹی مسلم کانفرنس وغیرہ شامل تھیں۔ سردار عبدالقیوم تھوڑی دور ہی چل سکے اور لاہور میں پریس کانفرنس کی جس میں ایم آر ڈی توڑنے کا اعلان کر دیا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے یہ سب کچھ سرکار کے کہنے پر کیا تھا۔ ان کے بعد خواجہ خیر الدین اس اتحاد کے صدر منتخب کیے گئے۔ نوابزادہ نصر اللہ اس کے ’’مرکزی قائد‘‘ تھے اور انہوں نے اپنے عظیم ساتھی کے مشن کو جاری رکھا۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخاب کا اس اتحاد نے بائیکاٹ کر کے صدر ضیاء الحق کو ’’کھلا میدان‘‘ مہیا کر دیا۔ اس بائیکاٹ کے بارے میں بہت سی باتیں کی گئیں۔ ایک واقعہ سن لیجیے۔

ایبٹ آباد میں ایم آر ڈی کی مرکزی کونسل کا اجلاس تھا۔ خواجہ خیر الدین کراچی سے ایبٹ آباد جاتے ہوئے لاہور میں صاحبزادی محمودہ بیگم کے گھر مقیم تھے۔ ان دنوں سید ممتاز مشرق لاہور کے سینئر رپورٹر تھے۔ راقم الحروف نے ان سے کہا کہ خواجہ صاحب آئے ہوئے ہیں ان سے ملاقات کی جائے۔ خبر بنے گی۔ میں اور سید ممتاز صاحبزادہ کی اقامت گاہ پہنچے۔ دوپہر کا وقت تھا وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر رک گئیں اور فرمایا کہ خواجہ صاحب اوپر کمرے میں سو رہے ہیں۔ تم لوگ بیٹھو بلکہ کھانا کھاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں۔ تم سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔ میں اور سید ممتاز ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ نوکر کھانا لے

لر آیا۔ ابھی ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ادھر سے پوچھا گیا کہ واجہ خیر الدین موجود ہیں۔ ہم نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔ فون پر کہا گیا کہ گورنر جنرل جیلانی ن سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اطلاع کر دیں۔ چند منٹ بعد فون کیا جائے گا۔ میں اور سید ممتاز اوپر کمرے میں گئے تو خواجہ صاحب مرحوم تہبند باندھے سو رہے تھے۔ ہم نے جگا کر انہیں فون کے بارے میں اطلاع دی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ خواجہ صاحب نے فون اٹھایا دوسری جانب گورنر پنجاب تھے۔ جی جناب کے بعد ''جی مال روڈ والے گیٹ سے'' فون بند ہوا۔ تو خواجہ صاحب نے ہم سے کہا کہ جنرل صاحب مشرقی پاکستان میں ہوا کرتے تھے وہاں سے ہماری ان سے ملاقات ہے اور یہ تاکید بھی کی اس کو ''آف دی ریکارڈ' رکھا جائے۔ خواجہ صاحب جلدی سے تیار ہوئے شیروانی پہنی اور گورنر ہاؤس روانہ ہو گئے۔ مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل ملک محمد قاسم مرحوم ان دنوں قید تھے اور ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ میں نے سید ممتاز سے کہا کہ ملک قاسم رہا ہو گئے ہیں۔ چلو ان کے گھر چلتے ہیں۔ سید ممتاز نے سوال کیا کہ تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا۔ میرا جواب تھا کہ گورنر پنجاب نے خواجہ صاحب کو ملاقات کے لیے بلایا ہے۔ تو پہلے خیر سگالی کے طور پر ملک قاسم کو رہا کر دیا ہوگا۔ جب ہم ملک قاسم کے گھر پہنچے تو وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہمیں دیکھ کر خاصے حیران بھی ہوئے۔

انتقال کی خبر

مولانا مفتی محمود کے انتقال کی خبر...... ایک بڑی خبر تھی جو جنگل میں آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی۔ اخبارات کے دفاتر میں فون کا تانتا بندھ گیا۔ جمعیت اور قومی اتحاد کے کارکن بڑی تعداد میں اخبار کے دفاتر پہنچ گئے۔ بہت سے ایسے تھے جو اس طرح رو رہے تھے کہ ان کا کوئی حقیقی عزیز رخصت ہو گیا ہو۔ جامع مسجد شیرانوالہ میں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہو گئے۔ جہاں لاؤڈ سپیکر پر مولانا مفتی محمود کے انتقال کا اعلان کیا گیا۔ کئی اخبارات نے ان کی وفات پر ضمیمے بھی شائع کیے۔ اگلے روز ۱۵/ اکتوبر کو حضرت مولانا مرحوم کی موت کی خبر لیڈ سٹوری تھی۔ ہر اخبار نے تین چار تصویریں بھی دیں۔

تعزیتی پیغامات بھی دیے گئے۔ ان میں صدر ضیاء الحق، گورنر سرحد لیفٹیننٹ جنرل فضل حق، وفاقی وزراء کے علاوہ قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کے قائدین، علماء کرام بڑی تعداد میں شامل تھے۔ مولانا مرحوم ٹھیک ٹھاک تھے ان کی اچانک موت سے سیاسی و دینی حلقوں میں سکتہ طاری ہو گیا۔ بہت سے لوگ منتظر تھے کہ مولانا مرحوم ضیاء الحق کے خلاف تحریک شروع کرنے والے ہیں کہ مرحوم ضیاء الحق نے عوام کو مایوس کیا تھا۔ جب وہ برسر اقتدار آئے تھے اگرچہ انہوں نے مارشل لاء لگایا۔ فوجی حکومت آئی اس کے باوجود عوام نے اس کا خیر مقدم یوں کیا کہ انہیں یقین تھا کہ مرحوم ضیاء الحق تحریک نظام مصطفیٰؐ کے مقاصد کو پورا کریں گے۔ یہی وجہ ہے ملک بھر میں ضیاء الحق کے آنے پر جگہ جگہ حلوہ کی دیگیں پکائی گئیں اور جب قومی

اتحاد کے وزراء فوجی حکومت میں شریک ہوئے تو عوام نے سکھ کا سانس لیا کہ ان کی قربانیاں رنگ لائیں گی۔ جلد اسلامی نظام نافذ ہوگا اور مرحوم صدر نے قومی اتحاد کی قیادت سے یہ پکا وسچا وعدہ بھی کیا لیکن یہ سراب ثابت ہوا اور جلد ہی قومی اتحاد کے وزراء حکومت سے باہر آ گئے۔ عوام میں مایوسی پیدا ہوئی اور اس ماحول میں مولانا مرحوم ''امید کی ایک کرن'' تھے اور آخری دنوں میں انہوں نے میدان میں نکلنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ اخبار میں جو خبر شائع ہوئی اس کا متن کچھ یوں تھا کہ

> ''ممتاز عالم دین صف اول کے سیاسی رہنما' مذہبی سکالر مولانا مفتی محمود کا آج یہاں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا- انا للہ وانا الیہ راجعون- ان کی عمر ۶۳ سال تھی- وہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے کل کراچی سے جدہ روانہ ہونے والے تھے- صدر ضیاء الحق کے حکم پر ان کے جسد خاکی کو کل پاک فضائیہ کے ایک خصوصی ڈی سی ۱۰ طیارے کے ذریعہ ملتان کے راستے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچایا جائے گا- جہاں انہیں ان کے آبائی گاؤں عبدالخیل میں سپرد خاک کیا جائے گا- مولانا مفتی محمود نیو ٹاؤن کی مسجد بنوری میں قیام پذیر تھے- آج دوپہر ساڑھے بارہ بجے وہ چند علماء کرام کے ساتھ مذہبی معاملات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ اچانک دل کا شدید دورہ پڑا- مولانا کو فوری طور پر طبی امداد کے لیے جناح ہسپتال پہنچایا گیا لیکن ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی ان کی روح جسد خاکی سے پرواز کر گئی- ڈاکٹروں نے انہیں دیکھتے ہی ان کے انتقال کی تصدیق کر دی- مولانا ذیابیطس کے پرانے مریض تھے لیکن ان کے ساتھیوں نے بتایا کہ ان کی صحت اچھی تھی اور کوئی تکلیف نہیں تھی- ڈیرہ اسماعیل خان میں ان کے صاحبزادے

فضل الرحمٰن کو ان کے انتقال کی اطلاع دے دی گئی۔''

۱۴۔ اکتوبر کی رات کراچی میں مولانا مفتی محمود کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جس میں نوابزادہ نصر اللہ خان، ولی خان نے بھی شرکت کی۔ مولانا مرحوم کے جنازے میں ہزاروں افراد شریک ہوئے۔ ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خان میں اگلے روز نماز جنازہ ہوئی جس میں ہزاروں افراد شریک ہوئے۔ مولانا مفتی محمود کے انتقال کی خبر سنتے ہی پورے صوبہ سرحد میں صف ماتم بچھ گئی اور ان کے سوگ میں بازار بند ہو گئے اور ہزاروں افراد نماز جنازہ میں شرکت کرنے کے لیے ڈیرہ اسماعیل خان روانہ ہو گئے۔ مرحوم صدر ضیاء الحق نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

مفتی محمود کی علمی اور تدریسی زندگی

حضرت مفتی محمود کی زندگی کا ایک اہم اور روشن پہلو ان کی عملی اور تدریسی زندگی ہے۔ جس سے وہ آخری وقت تک مصروف رہے۔ بنوری ٹاؤن مسجد میں اس وقت ان پر دل کا شدید دورہ پڑا جب وہ علماء کرام کے ساتھ صدر ضیاء الحق کے نافذ کردہ نظام زکوٰۃ پر مذاکرہ کر رہے تھے۔ مولانا مرحوم کی علمی اور تدریسی زندگی کے بارے میں مختلف مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اس سے ان کی سوانح اور خدمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ

مولانا مفتی محمود ٦ ربیع الثانی ١٣٣٧ھ مطابق 1919ء پنیالہ ڈیرہ اسماعیل خاں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خلیفہ محمد صدیق قوم افغان قبیلہ ناصر شاخ یحییٰ خیل والد بزرگوار افغانستان سے ترک وطن کر کے ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے اور ڈیرہ ہی کے ہو کے رہ گئے۔

حضرت مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ اسکول پنیالہ میں حاصل کی ساتھ ساتھ گھر پر دینی کتب پڑھتے رہے جب سکول کی تعلیم مکمل ہوئی تو استاذ نے مفتی صاحب کے والد کو تاکید کی کہ اس گوہر گراں مایہ کا خیال رکھیں اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کر کے مفتی محمود کی صلاحیتوں کو پنپنے کے مواقع فراہم کریں مگر خاندانی و ذہنی رجحانات کے باعث میٹرک کے بعد تمام تر توجہ عربی علوم کی تحصیل کے لیے منعطف ہوئی۔ صرف ونحو اور منطق کی ابتدائی کتب کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مزید تحصیل علم کے لیے مراد آباد دیو بند اور دہلی کا سفر کیا۔ حدیث شریف مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد میں حضرت مولانا فخر الدین سے پڑھی جو کہ مولانا محمود الحسن

دیوبندی اسیر مالٹا کے نامور شاگرد اور حدیث کے بلند پایہ استاذ تھے- ۱۳۶۰ھ بمطابق ۱۹۴۱ء میں مدرسہ شاہی مرادآباد سے سند فراغت حاصل کی-

تحصیل علم کی فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحب وطن واپس تشریف لائے اور اپنے گاؤں میں چار سال تک تدریس کی عیسیٰ خیل میانوالی میں تین سال تک مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں- ۱۹۵۰ء میں مدرسہ قاسم العلوم میں مدرس ہو گئے جہاں رفتہ رفتہ صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے اور منصب افتاء بھی آپ کے سپرد رہا-

اب تک کوئی بائیس ہزار شرعی فتوے آپ کے قلم سے نکل چکے ہیں جن کا مکمل ریکارڈ موجود ہے- اگر یہ چھپ جائیں تو دین حق کی ایک بڑی خدمت ہوگی- مدرسہ قاسم العلوم آج ملتان کے دو بڑے مدارس میں سے ایک ہے- یاد رہے کہ اس مدرسہ کی بنیاد حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے نام نامی سے اسے منسوب کیا گیا ہے-

مفتی محمود کی سیاسی زندگی کی ایک جھلک

۱۹۳۷ء میں آپ نے ہندوستان کے الیکشن میں جمعیۃ علماء ہند کی رکنیت سازی کی- ۱۹۴۲ء میں انگریز کے خلاف اٹھنے والی ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا- اس وقت حضرت مفتی صاحب نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اور جمعیۃ علماء ہند کی آل انڈیا کونسل کے رکن اور سرحد جمعیۃ علماء ہند کے کونسلر مقرر ہوئے- اس وقت آپ سرحد جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے صدر بھی بنے- تقسیم ملک کے بعد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی جماعت جمعیۃ علماء اسلام کے ممبر بنے- ۱۹۴۹ء میں علامہ موصوف نے ملتان میں جمعیۃ کا کنونشن بلایا تو آپ نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا-

۱۹۵۰ء میں حضرت مفتی صاحب کے والد کا انتقال ہوا اور اسی سال آپ مدرسہ قاسم العلوم

میں بطور معلم مقرر ہوئے اور دوسرے سال ہی مولانا مرحوم ناظم تعلیمات صدر مدرس اور استاد الحدیث مقرر ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی نظر بندی کے باعث ان کی جگہ امیر قرار پائے۔ اسی سال مولانا مفتی محمود نے ملکی دستور پر تنقیدات لکھیں جس پر پورے ملک سے انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں کا مارشل لاء لگا تو جمعیت بھی خلاف قانون قرار دی گئی۔ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خاں سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ تو بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں حضرت مفتی صاحب مرحوم اور ان کی جماعت نے عائلی قوانین کے خلاف ملک گیر تحریک چلائی۔ ۱۹۶۴ء میں آپ صدر ناصر کی دعوت پر موتمر عالمی کانفرنس میں قاہرہ گئے۔ یہاں ڈیڑھ سو علماء کے سامنے مفتی صاحب نے عالم اسلام کی یک جہتی اور اسلامی شریعت کی ترویج پر زور دیا۔ یہاں آپ کے عربی زبان میں شائع شدہ مقالوں کو نہایت وقعت سے دیکھا گیا۔ قاہرہ کے مذکورہ دور میں مفتی صاحب نے سعودی عرب اور کئی عرب ممالک کے شیوخ سے مدینہ، جدہ اور مختلف شہروں میں اسلامی اقدار کے موضوع پر تبادلہء خیال کیا۔ اسی سال مفتی محمود صاحب نے پاکستانی پارلیمنٹ میں پہلی بار اسلامی ترمیمات کے کئی بل پیش کیے اور ۱۹۶۵ء میں آپ نے ادارہ تحقیقات اسلامی اور اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی خلاف اسلام سرگرمیوں کے خلاف پورے ملک میں آواز اٹھائی۔ بالآخر یہ فتنہ سرد ہوگیا۔ ۱۹۶۷ء ستمبر میں ادارہ تحقیقات اسلامی نے مشینی آلات کے ذبیحہ سے متعلق ایک غیر اسلامی فتویٰ جاری کیا۔ مفتی صاحب نے اس فتویٰ کو تار تار کر کے پوری قوم کو حرام گوشت کھانے سے بچالیا۔

اسی سال ملتان میں جشن ملتان کے نام سے رقص و سرود ناچ گانوں کے ایک حکومتی پروگرام کا اعلان ہوا۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہیں پس دیوار زندان کر دیا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں راولپنڈی میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جونہی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا غیر اسلامی تعلیمات پر مبنی ایک مضمون پیش کیا گیا تو مفتی صاحب نے

ہزاروں غیر ملکی شیوخ کی موجودگی میں اس زہر کا تریاق پیش کر دیا۔ پوری کانفرنس میں آپ کے علمی استدلال اور زور بیان کی دھاک بیٹھ گئی۔ جنوری ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں جمہوری مجلس عمل کا قیام عمل میں آیا۔ تو مفتی صاحب اس کے مرکزی رکن منتخب ہوئے۔

۱۰ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایوب خان کی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو مفتی صاحب نے تاریخ ساز کردار ادا کیا اور پہلی بار پاکستان میں مذاکرات کی میز پر اسلام کے نفاذ کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء کو اٹھارہ دینی و سیاسی جماعتوں کا دینی محاذ قائم ہوا تو حضرت مفتی صاحب متفقہ طور پر صدر مقرر ہوئے۔ اسی سال کے عام انتخابات میں مفتی صاحب نے مسٹر بھٹو کو شکست فاش دی۔ ۱۹۷۱ء میں مفتی محمود کو مرکز میں وزارت پیش کی گئی مگر انہوں نے اسلامی مطالبات کی منظوری تک یہ پیشکش مسترد کر دی۔ ۱۹۷۲ء میں یکم مئی کو مفتی صاحب نے دو صوبوں میں اپنی واضح اکثریت کے باعث سرحد میں وزارت اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ اسی اثنا میں آپ نے اصلاحی معاشی اور سیاسی کارگزاری پر زبردست کام کیا اور حضرت مفتی صاحب نے ساڑھے نو ماہ کے عرصے میں اسلامی اقدار کا اتنا کام کیا کہ آج تک ان کے مقابلے میں کسی نے بھی ایک رتی کام نہیں کیا۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اسلام کے جید عالم حدیث کے ماہر اور فقہ کے شناور کی حیثیت سے اپنا جواب آپ تھے۔ افتاء میں بڑے بڑے علماء آپ پر اعتماد کرتے تھے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پوتے اور دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی نے تاریخ دیوبند میں مفتی صاحب کا نہایت وقیع لفظوں میں تذکرہ لکھا ہے۔ علامہ شمس الحق افغانی فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب علم و حکمت میں پچاس جید علماء سے بڑھ کر ہیں۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں کہ مفتی محمود عصر حاضر کے قابل فقیہ اور اسلامی قانون کی تدوین میں عالم اسلام میں ممتاز اور ایک سلیم الذوق محدث ہیں۔ سیاست، عمرانیات اور معاشیات پر گہری نظر رکھتے تھے اور فلسفہ منطق میں کمال درجہ عبور حاصل تھا۔ سائنس سے بھی بہت آشنائی تھی۔ عربی، فارسی اردو پشتو میں

یکساں مہارت تھی۔ انگریزی میں درخوار دانی تھی۔ عربی اس ادا سے بولتے تھے جیسے ہم آپ پنجابی بولتے ہیں۔

ذاتی اوصاف کے اعتبار سے مفتی صاحب ایک بلند پایہ انسان تھے اگر مختصر کہوں تو اتنا کافی ہے کہ کردار کی انگوٹھی میں اخلاق کا نگینہ ہے۔ ہر لحظہ مسکرانے کی عادت مزاج میں ترقی، طبیعت میں انکسار بے حد ٹھہرا ہوا انسان، استقامت، عزیمت، علم، حلم، وقار، تدبر، فراست، ذہانت اور اخلاق کو گوندھ کر اگر انسانی وجود تیار کیا جائے تو وہ مفتی محمود ہوں گے۔ مفتی صاحب کی خوبیوں کا اگر نچوڑ نکالا جائے تو وہ پانچ چھ چیزیں ہوں گی۔ ایمان، یقین، فراست، فہم، صبرو تحمل، عزیمت، استقامت اور امانت و دیانت۔

پاکستان میں اسلام کا نفاذ تو کیا ہوتا یہ دنیا کا بدنصیب ملک تھا جہاں قصر نبوت میں کھلے بندوں نقب لگ رہی تھی۔ ایک طرف تو یہ ہو رہا تھا دوسری طرف پاکستان کو طبقاتی ریاستوں کی طرح تقسیم کرنے کی در پردہ سازشوں کے سلسلہ میں کھلے بندوں از خود جواز مہیا کیا جانے لگا۔ قادیانیوں کی ان اشتعال انگیز سرگرمیوں میں روز بروز کے اضافے کے باعث احتساب کی قدرتی چکی نے اپنا عمل شروع کر دیا اور ملک بھر میں قادیانیوں کے خلاف ایک غضب ناک عوامی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ تحریک کے مقاصد میں یہ تین چیزیں داخل تھیں۔ (۱) عقیدہ ختم نبوت کو دستوری تحفظ دیا جائے۔ (۲) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ (۳) کلیدی ملازمتوں پر فائز قادیانیوں کو برطرف کیا جائے۔ یہ پاکستان کی اہم ترین دینی تحریک تھی جو ۱۹۵۲ء میں شروع ہوئی۔ اگرچہ بظاہر حکومت نے اس تحریک کو بے رحمی کے ساتھ کچل دیا مگر فی الحقیقت مسلمانوں نے بیش بہا جانی و مالی قربانیاں دے کر لادین ذہنیت کو شکست فاش دی اور عقیدہ ختم نبوت کے آئینی تحفظ کا مستقل موقف قائم کر دیا تو مولانا مفتی محمود نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور اس جرم کی پاداش میں ایک سال قید کی سزا پائی۔ آپ کو ملتان جیل میں رکھا گیا۔ یہ مفتی صاحب کی پہلی قید تھی۔

قدرت جب کسی کو سزا دینا چاہتی ہے تو انتظام بھی عجیب وغریب کرتی ہے- قادیانیوں کی اسلام اور پاکستان دشمن سرگرمیوں کے باعث مسلمانانِ پاکستان پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے- ادھر مئی ۱۹۷۴ء کے آخری دنوں میں قادیانیوں نے ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مسلمان طلبہ کو پیٹ ڈالا- یہ بھس میں چنگاری ڈالنے والی بات تھی- ملک بھر میں اس کا مؤثر ردعمل ہوا چند ہی دنوں میں قادیانیوں کو لینے کے دینے پڑ گئے- شہروں کے شہر بستیوں کی بستیاں رسالت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کے لیے میدان عمل میں کود پڑیں- ۱۹۵۳ء کے بعد اس مسئلے پر زوردار تحریک اٹھی جب حکومت نے دیکھا یہ سیل بے پناہ کسی طرح نہیں تھمتا تو اس مسئلے کو قومی اسمبلی میں لے گئے- قومی اسمبلی میں ۳۰ جون ۱۹۷۴ء کو حزب اختلاف کے ۳۷ ارکان نے جن میں سرفہرست مفتی صاحب کا نام تھا- یہ قرارداد ایوان میں پیش کی- خود مفتی صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ مسئلہ بہت بڑا اور مشکل مسئلہ تھا- خدا تعالیٰ نے پورے ایوان پر مشتمل اس خصوصی کمیٹی کے روبرو حزب اختلاف کی ترجمانی کا شرف مفتی صاحب کو عطا کیا- جنہوں نے رات رات بھر جاگ کر مرزا غلام قادیانی کی کتابیں مطالعہ کیں- حوالے نوٹ کیے اور پھر جرحی سوالات کو ترتیب دیا اس کا نتیجہ تھا کہ جب مرزا ناصر احمد پر جرح کا آغاز ہوا تو بقول مفتی صاحب ہمارا کام تو پہلے دن ہی بن گیا تھا- یہ جرح تیرہ روز جاری رہی- گیارہ دن ربوہ گروپ پر جو مرزا قادیانی کو نبی تسلیم کرتا ہے اور دو دن لاہوری پارٹی پر جو مرزا قادیانی کو مجدد مانتی ہے- ہر روز آٹھ گھنٹے جرح ہوتی اس طویل جرح وتنقید نے قادیانیت کے بھیانک چہرہ کو بے نقاب کر دیا-

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء ہماری تاریخ کا وہ یادگار دن ہے جب ۱۹۵۳ء، ۱۹۷۴ء کے شہیدان ختم نبوت کا خون رنگ لایا اور ہماری قومی اسمبلی نے اپنی تاریخ میں پہلی بار مسلم اکثریتی امنگوں کی ترجمانی کی اور ختم نبوت کے عقیدت کو آئینی تحفظ دے کر قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا-

اس تاریخی فیصلے کے اعلان کے بعد اسمبلی میں ایوان کے تمام اہم راہنماؤں نے اپنے اپنے تاثرات بیان کیے۔ مفتی صاحب نے فرمایا اس فیصلے پر پوری قوم مبارک باد کی مستحق ہے۔ اس میں نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام میں اطمینان کا اظہار کیا جائے گا۔ میرا خیال ہے مرزائیوں کو بھی اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کر لینا چاہیے۔ جہاں تک کریڈٹ کا سوال ہے یہ مسئلہ قومی بنیادوں پر تمام تر سیاسی اختلاف سے بالاتر ہو کر طے کیا اس مسئلے کے حل میں ارکان قومی اسمبلی اور سینٹ نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجلس عمل نے پر وقار جدو جہد جاری رکھی۔ حالانکہ فائرنگ ہوئی لوگ شہید ہوئے۔ لاٹھی چارج گرفتاریاں اور تشدد کے تمام واقعات کے باوجود خود ردعمل کا شکار ہو کر تشدد کا راستہ اختیار نہ کیا۔ سیاسی طور پر تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ الجھے ہوئے مسائل کا حل بندوق کی گولی میں نہیں ہے بلکہ مذاکرات کی میز پر ہے اور قومی محاذ نے بھٹو حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف ۳۰ جولائی کو ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت کو خبردار کیا۔ اگر شہری آزادیاں ۲۴ اگست تک بحال نہ کی گئیں۔ تو ملک گیر تحریک شروع کر دی جائے گی اور سات مزید مطالبات پیش کیے گئے اور دھمکی دی گئی کہ اگر چودہ اگست تک انہیں عملاً تسلیم نہ کیا گیا تو محاذ میں شامل جماعتیں یا افراد حکومت کے ساتھ کسی قسم کے سیاسی مذاکرات نہیں کریں گے۔ اگرچہ یہ تحریک اپنے مقاصد تو حاصل نہ کر سکی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اپوزیشن نے ملک میں سناٹا قائم نہ ہونے دیا۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے مسٹر بھٹو کی حکومت نے حد درجہ شرمناک ہتھکنڈے استعمال کیے حتیٰ کہ علماء کے ساتھ فاحشہ عورتوں کو بٹھا کر ان کی تصویریں اتروائیں۔ غرض اس تحریک کو دبانے کے لیے بھٹو حکومت بدتہذیبی کی آخری حد تک پہنچ گئی لیکن حضرت مولانا مفتی محمود کی قیادت میں علماء کرام نے ہر ظلم و جبر کا مقابلہ کیا اور اپنے مشن کو جاری رکھا اور بھٹو آمریت کے سامنے دیوار بن گئے۔ ایسی دیوار جس نے انہیں ''عوامی مطالبات'' کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ مولانا مفتی محمود کا ایک بڑا سیاسی کارنامہ اور کامیابی ہے۔

حضرت مفتی محمودؒ کے انتقال پر

میاں طفیل محمد، جناب نوابزادہ نصر اللہ خان
سردار عبدالقیوم خان، مولانا عبیداللہ انور
مولانا صلاح الدین

کے تاثرات

مفتی صاحب ایک عظیم رہنما تھے

مفتی محمود مدرسہ قاسم العلوم کے مہتمم تھے۔ ہمارے میاں محمد باقر خان صاحب جو ملتان کے امیر تھے۔ وہ مفتی صاحب کے بہت ہی دوست تھے جب بھی میرا ملتان جانے کا پروگرام ہوا باقر خان صاحب مفتی صاحب کو بلا لیتے تھے یا میں ان کے ساتھ مفتی صاحب کے مدرسے میں چلا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بارہا ان کے مدرسے میں گئے۔ جہاں دو مرتبہ میں نے مدرسہ قاسم العلوم کے طلباء سے خطاب بھی کیا۔ اس وقت ہم مفتی صاحب کو جماعت اسلامی کے بہت قریب محسوس کرتے تھے۔ بعد ازاں جب جمعیت علمائے اسلام بنی تو وہ اس میں شامل ہو گئے اور جمعیت کے بہت ہی نامور راہنما کی حیثیت سے ابھرے جس کے بعد ہمیں ان کے ساتھ ایک سیاسی رفیق اور راہنما کی حیثیت سے کئی برس تک کام کرنے کا موقع ملا۔ خاص طور پر پاکستان قومی اتحاد کے زمانے میں وہ اس کے صدر بھی تھے۔ سفر میں بھی، جلسوں میں بھی جلوسوں میں بھی، گولیوں کی بوچھار اور لاٹھیوں کی زد میں بھی، نجی محفلوں میں اور پبلک جلسوں میں بھی غرضیکہ ہر جگہ ہمیں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اس دوران مفتی صاحب کو بہت عظیم شخصیت پایا۔ فہم و فراست کے لحاظ سے، معاملہ فہمی کے اعتبار سے اور ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے بھی وہ عظیم تھے جس سیاسی سوجھ بوجھ اور سیاست دان ہونے کا مظاہرہ انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ اس معاملہ میں کیا جب مسٹر بھٹو صاحب برسر اقتدار تھے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے کیونکہ نیشنل عوامی پارٹی کے مقابلہ میں ان کی طاقت بہت کم تھی لیکن انہوں نے ان سے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ حاصل کی اور پھر بہت خوبی کے ساتھ اپنے سارے فرائض انجام دیے جس سے اس بات کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ مفتی

صاحب صرف عالم دین ہی نہیں تھے بلکہ ان کے اندر وہ قابلیت اور صلاحیت موجود تھی جو صحیح معنی میں ایک مسلمان رہنما کے اندر موجود ہونی چاہیے۔

مزید براں بھٹو صاحب جیسے ظالم، جابر اور سنگ دل حکمران کے مقابلے میں جس جرات، بہادری اور استقلال کے ساتھ انہوں نے تحریک نظام مصطفیٰ کی رہنمائی کی ہے اپنی مستقل مزاجی اور جرات مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا مظاہرہ سیاسی زندگی میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ انہوں نے ذرہ برابر ہچکچاہٹ اور کمزوری کسی موقعہ پر نہیں دکھائی۔ اس سے بھی مفتی صاحب کی خوبیوں، عالمانہ اور سیاسی سوجھ بوجھ کا خوب اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بھٹو کے دور میں ہم تقریباً ڈھائی ماہ اکٹھے جیل میں نظر بند بھی رہے ہیں۔ جیل ایک ایسی جگہ ہے جہاں آدمی کے کردار اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ پردے میں نہیں رہتا۔ وہاں بھی ہم نے مفتی صاحب کی زندگی کو بہت صاف ستھرا پایا۔ جیسا کہ ایک مسلمان رہنما اور لیڈر کو ہونا چاہیے۔

درحقیقت مسلمانوں کے اندر وہ شخص رہنمائی کا اہل ہی نہیں ہے جو صرف مذہب کے مسائل جانتا ہو، دنیا کے مسائل سے ناواقف ہو، وہ شخص مسلمانوں کی رہنمائی کا اہل نہیں ہو سکتا جو صرف دنیا کے معاملات پر نظر رکھتا ہو اور اسے دینی معاملات سے ناواقفیت ہو۔ یہ دونوں قسم کے لوگ مسلمانوں کے دینی رہنما بن سکتے ہیں اور نہ ہی دنیاوی راہنما بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں اللہ تعالیٰ نے جو دین دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام معاملات کو خدا کے دین اور احکام کے مطابق چلایا جائے۔ مسلمان کہتے ہی اس کو ہیں جو دنیا کے معاملات کو خدا کی کتاب اور خدا کے رسول کی تعلیمات کے مطابق چلائے۔ اس لیے مسلمانوں کا رہنما وہی ہو سکتا ہے اور اسی کو بنانا چاہیے جو دین اور دنیا دونوں سے یکساں واقف ہو اور معاملات دنیا کو دین کی رہنمائی میں حل کر سکتا ہو چلا سکتا ہو اور لوگوں کی رہنمائی کر سکتا ہو۔ اس لیے مفتی صاحب جیسے لوگ ہی مسلمانوں کے رہنما ہو سکتے ہیں ہونے چاہئیں۔

میاں طفیل محمد

امیر جماعت اسلامی پاکستان

وزیراعلیٰ چٹائی پر بیٹھ کر احکام جاری کرتا رہا

مفتی محمود صاحب ۱۹۶۲ء کی قومی اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب ہوئے اور ۶۲ سے ہی قومی سیاست میں عملی طور پر آئے ان کے ساتھ میرا تعارف بھی اسی دوران ہوا۔ مولانا محمد علی جالندھری مرحوم مفتی صاحب کو میرے پاس لے کے آئے۔ کیونکہ وہ پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ انہیں پارلیمانی روایات کے بارے میں اتنی آگاہی نہ تھی۔ مولانا محمد علی جالندھری کا خیال تھا کہ میں ان کی کسی قدر اعانت کرسکوں گا۔ یوں مفتی صاحب کے ساتھ تعلقات کا آغاز ہوا۔ انہوں نے اس اسمبلی کے دوران اکثر و بیشتر مرحلوں میں حزب مخالف کا ساتھ دیا۔ بعدازاں ایوب خاں مرحوم کے خلاف مختلف تحریکوں کا آغاز ہوا۔ جس کے آخر میں ۱۹۶۹ء کے دوران جمہوری مجلس عمل قائم ہوئی۔ مفتی محمود اس جمہوری مجلس عمل کے ایک رکن تھے۔ ان کی جمعیت علماء اسلام بھی جمہوری مجلس عمل کی رکن سیاسی جماعتوں میں سے ایک تھی۔ گول میز کانفرنس میں جب ایوب خاں مرحوم کے ساتھ مذاکرات ہوئے تو مفتی صاحب بھی مذاکرات کی میز پر موجود تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ ڈیرہ اسماعیل خاں سے کامیاب ہوئے اور اس مرتبہ ان کے حریف جناب ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ بھٹو صاحب نے اس ایک نشست کے علاوہ ان تمام نشستوں پر کامیابی حاصل کی جن سے وہ کھڑے ہوئے یہ واحد نشست تھی جس پر وہ مفتی صاحب کی بے مثال مقبولیت کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد جب بھٹو صاحب وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے

تو کچھ عرصہ کے بعد صوبہ سرحد اور بلوچستان میں کالعدم جمعیت علمائے اسلام اور کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کی مخلوط حکومتیں قائم کی گئیں۔ صوبہ سرحد کی حکومت کے سربراہ مفتی صاحب تھے۔ قومی سیاست میں ایک قائد کے کردار کا اندازہ لگانے کے لیے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ جو مقاصد حزب اختلاف میں رہتے ہوئے اس کے پیش نظر رہے کیا برسر اقتدار آنے کے بعد انہیں پورا کرنے کے لیے استقامت کے ساتھ خلوص کا مظاہرہ کیا گیا یا نہیں۔ اس سلسلے میں ایک نظر ڈالنے سے یہ ناقابل تردید حقیقت سامنے آتی ہے کہ مفتی صاحب جو اسلامی روایات اور جمہوری اقدار کے ہمیشہ علمبردار رہے تھے۔ برسر اقتدار آنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی روایات کو عملی جامہ پہنانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ چنانچہ جہاں تک اسلامی روایات کا تعلق ہے انہوں نے امتناعِ شراب کے قوانین جاری کیے اور پہلی مرتبہ صوبہ سرحد میں شراب پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ جمعہ کی تعطیل کے بارے میں بھی پہلی مرتبہ سفارش صوبہ سرحد کی حکومت نے کی۔ سرکاری ملازمین کو قومی لباس پہننے کے لیے کہا گیا اور صوبے کا وزیر اعلیٰ خود ایک چٹائی پر بیٹھ کر انتظامیہ کے تمام کام سرانجام دیتا رہا اور اسی حالت میں جب حکومت کے سیکرٹری اور دیگر افسران ان کے پاس پہنچتے تھے اور اس دوران نماز کا وقت ہو جاتا تھا تو مفتی صاحب امامت کراتے اور یہ افسران بھی نماز پڑھنے پر مجبور ہو جاتے۔ جہاں تک جمہوری اقدار کا تعلق ہے یہ بات ان کے مخالفین بھی تسلیم کریں گے کہ ان کے پورے دور حکومت میں صوبہ سرحد کے طول و عرض میں کسی جگہ بھی دفعہ ۱۴۴ نافذ نہیں کی گئی۔ اخبارات کے خلاف کوئی بھی تعزیری اقدام نہیں کیا گیا اور نہ ہی انہیں مجبور کیا گیا کہ حکومت کی ہمنوائی کریں۔ اس کے علاوہ کسی سیاسی مخالف کو نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ پہلی مرتبہ یہ روایت بھی مفتی صاحب نے قائم کی کہ جس اکثریت کی نمائندہ حکومت کو بلاوجہ ختم کیا گیا تو انہوں نے اس کے خلاف احتجاجاً اپنی حکومت کا استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس سے قبل پاکستان میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ ایک اصول کی پاسداری میں کسی سیاست دان نے اقتدار سے دست کش ہونے کا فیصلہ کیا ہو۔ اقتدار سے

محروم ہونے کے بعد بھی مفتی صاحب کا کردار حب الوطنی اور اسلامی تقاضوں کے مطابق رہا- ایسا نہیں ہوا کہ وہ اس تلخی کی وجہ سے ملکی تقاضوں کو نظر انداز کرتے چنانچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۷۳ء کے آئین کی تکمیل میں مفتی محمود صاحب نے بڑا کردار ادا کیا اور کالعدم جمعیت علمائے اسلام اور کالعدم نیشنل عوامی پارٹی اس مرحلہ پر تعاون نہ کرتیں تو آئین بنانا ممکن نہ ہوتا- بلوچستان سے قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کا کوئی نمائندہ نہیں تھا اس سے ظاہر ہے کہ اس بنا پر ان اقلیتی صوبوں کے نمائندوں کے عدم تعاون سے وفاقی آئین کی تشکیل ناممکن تھی- کیونکہ ایک آئین کا ہونا ملک کے سیاسی استحکام کے لیے انتہائی اہم ہوتا ہے- اس معاملے میں مفتی صاحب نے حکومت کے غیر ضروری اقدامات کو نظر انداز کرتے ہوئے ملک کے وسیع تر مفادات کو پیش نظر رکھا اور آئین میں بھرپور حصہ لیا- چنانچہ ۷۳ء کے آئین میں جتنی اسلامی دفعات موجود ہیں ان کو آئین کا حصہ بنانے میں مفتی صاحب کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ تھا- اس کے بعد اسی آئین میں صوبائی خودمختاری کی جو حدود متعین کی گئیں ان کے بارے میں بھی اپنے رفقاء کو آمادہ کرنے میں مفتی صاحب کا بڑا ہاتھ تھا- اس طرح ملک کو ۱۹۷۳ء کا وہ آئین مل سکا جس پر ملک کی تمام جماعتوں کے رہنماؤں نے دستخط کیے-

جب ملک میں تحریک ختم نبوت چلی تو اس وقت ملک کے تمام مکاتب فکر کو متحد کرنے میں مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم اور مفتی صاحب نے بڑا نمایاں کارنامہ سرانجام دیا- اس طرح ملک کے طول و عرض میں مولانا بنوری کی قیادت میں تحریک چلائی گئی- جہاں تک قومی اسمبلی کا تعلق ہے وہاں اس تحریک کی قیادت مفتی صاحب کے ہاتھ میں تھی- بالآخر یہ تحریک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیاب ہوئی اور نوے سالہ پرانا قادیانی مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا- قومی اسمبلی میں ایسی سیاسی جماعتیں بھی تھیں جو اپنے رنگ ڈھنگ اور کردار کے اعتبار سے سیکولر تھیں- لادینی نظام کی علمبردار تھیں- اس کے باوجود یہ مفتی صاحب کا اثر و رسوخ تھا کہ ان جماعتوں نے بھی ختم نبوت کے معاملہ میں پورا تعاون کیا اور متفقہ طور پر قانون اسمبلی میں منظور

کرلیا گیا۔

جس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کے لیے جتنے بھی دینی مکاتب فکر ہیں انہیں متحد کرنے کے لیے جس وسعت قلب اور وسعت نظر کی ضرورت ہے وہ مفتی صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ انہوں نے ہمیشہ تعصبات سے بلند ہو کر اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جیسا کہ ختم نبوت کی تحریک کے دوران ہوا۔ اس طرح مختلف سیاسی جماعتوں کو بنیادی اقدار پر متحد کرنے کے لیے بھی مفتی صاحب جتنی سعی و جہد کر سکتے تھے انہوں نے اس میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ چنانچہ جب بھٹو صاحب کی مطلق العنان حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے U.D.F قائم کیا گیا تو مفتی صاحب اس کی تشکیل میں پیش پیش رہے۔ انہیں اس کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ بے حد مصائب اور مشکلات کے باوجود مفتی صاحب کے ملک نے طول و عرض میں دورے بھی کیے اور رفقاء کے دوش بدوش بحالی جمہوریت کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ جب بھٹو صاحب نے ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا تو ملک کی تمام قومی سیاسی جماعتیں متحد ہوئیں اور کالعدم پاکستان قومی اتحاد کی تشکیل عمل میں آئی۔ تمام کالعدم سیاسی جماعتوں نے بالاتفاق مفتی صاحب کو اپنا صدر منتخب کیا۔ چنانچہ انہی کی قیادت میں ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں حصہ لیا گیا۔ جب انتخابات کے نتائج کو مسٹر بھٹو کی حکومت نے دھاندلی کے ذریعے تبدیل کرنے کی کوشش کی تو اس کے خلاف وقت ضائع کیے بغیر تحریک شروع کر دی گئی۔ یہاں بھی مفتی صاحب نے قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہونے کا ثبوت دیا اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ بروقت فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ کالعدم پاکستان قومی اتحاد نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہ فیصلہ کیا کہ وہ قومی اسمبلی کے جعلی نتائج کو مسترد کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی صوبائی اسمبلی کے انتخابات سے اپنے امیدواروں کو دستبردار ہونے کا فیصلہ دیا گیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ عین اس وقت جب کالعدم قومی اتحاد کے اکثر و بیشتر امیدوار اپنی انتخابی مہم مکمل کر چکے تھے اور صرف دو دن کے بعد انتخابات ہونے والے تھے انہوں نے اس فیصلہ کے سامنے سر

تسلیم خم کر کے سیاسی ڈسپلن کی نہایت روشن مثال قائم کر دی۔ اس دوران جب ملک میں ہڑتال کی اپیل کی گئی تو یہ بھی واقعہ ہے کہ کراچی سے پشاور تک ملک کا کوئی ایک شہر بھی ایسا نہ تھا جہاں مکمل ہڑتال نہ کی گئی ہو۔ اس تحریک کے دوران ایثار و قربانی کے وہ لازوال مظاہرے دیکھنے میں آئے جن کی مثال اس سے پیشتر برصغیر کی پوری تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ مفتی صاحب اور ان کے رفقاء کے خلوص جرأت اور عزیمت کے جذبہ کی وجہ سے تھا کہ پوری قوم Inspire ہوئی اور اس نے مسٹر بھٹو کی حکومت کے ہر جبر و استبداد کا مقابلہ کیا۔

بالآخر جب بھٹو حکومت نے مذاکرات کی پیشکش کی تو مفتی صاحب کی قیادت میں کالعدم قومی اتحاد نے یہ اعلان کیا کہ جب تک قومی اسمبلی کے انتخابات کے از سر نو انعقاد کا اعلان نہیں کیا جائے گا اس وقت تک مذاکرات نہیں کیے جائیں گے۔ اس دوران حکومت کی طرف سے ترغیب و تخویف کا ہر حربہ آزمایا گیا لیکن مفتی صاحب کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ حتیٰ کہ مشرق وسطیٰ کے برادر اسلامی ممالک کے سفیر صاحبان کو مفتی صاحب کے پاس بھجوایا گیا۔ سہالہ میں یہ ملاقاتیں کی گئیں اور کوشش کی گئی کہ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو لیکن مفتی صاحب انتخابات پر جمے رہے۔ حتیٰ کہ اس وقت کی حکومت کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ قومی اسمبلی کے انتخابات از سر نو ہوں گے۔ جس کے بعد مذاکرات میں شرکت کی گئی۔

جہاں تک مذاکرات کا تعلق ہے یہ بات اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ کالعدم قومی اتحاد میں بھی دو مکاتب فکر تھے۔ کچھ حضرات یہ سمجھتے تھے کہ مسٹر بھٹو کی حکومت کے ساتھ مذاکرات نہیں ہونے چاہئیں لیکن مفتی صاحب کا یہ خیال تھا کہ جمہوری تحریکوں میں ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ قوم کی قربانیوں کو بامقصد اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے حکومت کے ساتھ مذاکرات کیے جائیں اور ان مقاصد کو حاصل کیا جائے جن کے لیے قوم نے قربانیاں دیں۔ اس کی مثال برصغیر کی تحریک آزادی میں اکثر ملتی ہے۔ جلیانوالہ اور قصہ خوانی بازار کے مظالم اور قتل عام کے باوجود جب بھی برطانوی حکومت نے مذاکرات کی پیشکش کی۔ لندن میں گول میز کانفرنس

منعقد ہوئیں تو اس میں رائے عامہ کے تمام رہنماؤں نے بلا تامل شرکت کی - خواہ ان کا تعلق کسی بھی سیاسی جماعت سے تھا - لارڈ ویول نے جب شملہ میں کانفرنس طلب کی تو اس میں مسلم لیگ کانگریس اور دیگر جماعتوں نے حصہ لیا - مفتی صاحب یہ سمجھتے تھے کہ جمہوری نظام کی بحالی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مذاکرات سے اس تحریک کی طاقت کی بنیاد پر قومی مقاصد کو حاصل کیا جائے - بالآخر مذاکرات کا آغاز ہوا - مذاکرات کرنے والی سہ رکنی ٹیم کی قیادت مفتی صاحب کر رہے تھے - ان مذاکرات میں کامیابی کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسٹر بھٹو کو کالعدم قومی اتحاد کے پیش کردہ ۳۲ نکات میں سے ۳۱ منظور کرنا پڑے جن میں سے سرفہرست اس وقت کی نام نہاد قومی اسمبلی کا خاتمہ اور از سرنو انتخابات تھے - دوسری بات صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا انتظام کرنا اور صوبائی حکومتوں کا خاتمہ تھا -

مفتی صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ علماء حضرات کو گوشہ گمنامی سے نکال کر سیاست کی گہما گہمی میں لے آئے حالانکہ برطانوی دور میں انہیں ایک (کمی) کی حیثیت دی گئی تھی اور انہیں صرف مسجد و مدرسہ تک محدود کر دیا گیا تھا - یہ وہ دور تھا جب ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ علماء کا ایک طبقہ یہ خیال کرنے لگا کہ عبادات کی حد تک چونکہ برطانوی عہد میں آزادی ہے اس لیے اس پر قانع رہنا چاہیے - اسی چیز کو اقبال کہتے ہیں کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
بے چارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

لیکن علماء کا ایک ممتاز طبقہ اس وقت بھی ایسا تھا جو وطن عزیز کی آزادی کے لیے ہمیشہ سرگرم کار رہا اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی سرفروشی اور ایثار کے واقعات سے قوم میں جذبہ حوصلہ اور امنگ پیدا کی - پاکستان بننے کے بعد ایک طویل عرصہ تک اس مکتب فکر کے علماء نے یہ کوشش کی کہ ملک کی سیاسی تنظیموں کو اسلامی نظام نافذ کرنے پر آمادہ کیا جائے اور حکمران طبقے پر اپنا اثر ڈالا جائے - بالآخر مفتی صاحب اور ان کے ہم خیال علماء نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود

عملی سیاست میں حصہ لیں تاکہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں اور زیادہ آسانی ہو سکے۔ جب وہ انتخابات میں کامیاب ہوئے اور انہیں وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ایک صوبے کی زمام اقتدار سونپی گئی اور دوسرے صوبے میں وہ شریک اقتدار تھے تو انہوں نے ان دونوں صوبوں میں یہ بات ثابت کر دی کہ ایک عالم دین اپنی مذہبی روایات اور اقدار کو باقی رکھتے ہوئے بھی اس دور میں ایک مثالی حکومت ملک کو دے سکتا ہے۔ یہ امتزاج بڑا کٹھن ہے کہ یہ دونوں چیزیں یعنی مذہب اور سیاست ساتھ ساتھ رہیں۔ نیز حکومت میں جس رواداری، تحمل، حوصلہ وسیع النظر فی اور تعصبات سے بالاتر ہونے کی ضرورت ہے اور یہ بھی کہ ہر ایک کو حصول انصاف کا یقین حاصل رہے۔ بڑا مشکل کام ہوتا ہے لیکن مفتی صاحب کے دور میں یہ تمام باتیں روزمرہ مشاہدہ میں رہیں۔ مجھے علم ہے کہ انہوں نے اکثر اپنے مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کے بارے میں کہا کہ جو بھی فرقہ وارانہ تعصبات کو ہوا دے گا وہ اسے اپنی جماعت سے علیحدہ کر دیں گے۔ اس معاملہ میں وہ اس قدر وسیع الخیال تھے۔

مفتی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دینی مقاصد کے لیے سیکولر جماعتوں کا تعاون بھی حاصل کیا اور شہری آزادیوں کے لیے ان جماعتوں کا مکمل طور پر ساتھ دیا۔ مفتی صاحب کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے ایک عالم دین کے بارے میں اس تعصب کو رفع کر دیا کہ وہ صرف مسجدوں اور مدرسوں تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھنے کا پابند ہے۔ نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے انہوں نے وہ طاقت فراہم کرنے کے لیے علماء کے طبقہ کو متحرک کیا۔

یوں مفتی صاحب کا وجود اس ملک کے لیے انتہائی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ قومی سیاست میں جو مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ اس کے حصول کی تمنا ہر ایک کو ہوتی ہے اور حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے نہایت مختصر زندگی میں یہ مقام و مرتبہ حاصل کر لیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ خارجی صورت حال کی بنا پر ہمارے انتہائی حساس خطوں سرحد اور بلوچستان میں سب سے زیادہ مضبوط اور توانا

طاقت اسلام اور ملکی سالمیت کے لیے مفتی صاحب ہی کی تھی اور اسی طرح ملک کے طول وعرض میں چند اشخاص ہیں جن کو آپ معروف یا مقبول کہہ سکتے ہیں یا ایسے لوگ کہہ سکتے ہیں جو مختلف علاقوں صوبوں کے درمیان پل کا کام دے سکیں۔ مفتی صاحب کی ان میں نمایاں حیثیت تھی۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پر نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے کسی ایک فرد کی جانب دیکھنے کی جگہ ہمیں اجتماعی قیادت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔

نوابزادہ نصر اللہ خاں

مفتی صاحب کی وفات کی خبر نے مجھ پر وہی اثر کیا جو سقوطِ مشرقی پاکستان کی خبر نے کیا تھا

مفتی صاحب کے ساتھ جان پہچان کے حوالے سے تعلق تو بہت دیر سے تھا لیکن زیادہ تعلق تب ہوا جب وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے اور میں آزاد کشمیر کا صدر تھا۔ اس وقت ایک سبب تو ان کے ساتھ ملاقاتوں کا یہ ہوا کہ کشمیر میں ہم نفاذ اسلام کی خاطر جو کوشش کر رہے تھے اس سلسلے میں ان سے وقتاً فوقتاً ان کی رائے معلوم کرنا، ان کے علم سے استفادہ مقصود تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں جس کی بنا پر بعض مسائل مشترک تھے اس لیے بھی مفتی صاحب کے ساتھ رابطہ رکھنا ضروری تھا۔ دورِ اقتدار میں اگرچہ زیادہ میل ملاقات کا موقع نہ ملا۔ دور دور سے بات ہوتی رہی اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں ان سے وقتاً فوقتاً گفتگو ہوتی رہی۔ اس ضمن میں ہم نے آزاد کشمیر میں جو کچھ کیا اس میں مفتی صاحب کی رہنمائی اور ان سے استفادہ شامل تھا۔ UDF میں بھی کچھ عرصہ تک مفتی صاحب کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ میں یہاں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ میں بتقاضائے بشریت یہ کمزوری موجود ہے کہ میں بعض لوگوں کو ان کی خوبیوں خامیوں سے قطع نظر اچھا یا برا سمجھنے لگتا ہوں۔ مفتی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں میں اچھا سمجھتا تھا۔ وہ کچھ بھی کرتے لوگوں کے نزدیک ان کی کوئی بات قابل اعتراض ہوتی نہ ہوتی میں انہیں بہر حال اچھا ہی سمجھتا۔ پھر یہ تعلق ہو گیا جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد

UDF میں اکٹھے رہے اس دوران میں نے مفتی صاحب کو بڑا حوصلہ مند، ہمت والا، بڑی فراست والا شخص پایا۔ اگرچہ ان کے ساتھ رفاقت کا بہت تھوڑا وقت ملا تھا۔ جس کے بعد میں قید ہو گیا۔ حراست کے دوران سہالہ کیمپ میں ہم اکٹھے کر دیے گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب مفتی صاحب کو زیادہ قریب سے اور مسلسل دیکھنے کا موقع ملا۔ قید کے دوران مذاکرات کے دوران اور پھر مارشل لاء کے نفاذ کے بعد بہت عرصہ تک قریب رہنے کا موقع ملا۔ اس تمام عرصہ میں میں نے محسوس کیا کہ وہ انسانی اعتبار سے، اخلاقی اعتبار سے ہمیشہ قابل احترام تھے۔ علم دین کے اعتبار سے ممکن ہے کہ ملک کے اندر ان سے بہتر لوگ موجود ہوں کیونکہ کوئی بھی شخص علم کی حد بندی نہیں کر سکتا اور یہ طے کرنا بڑا مشکل کام ہے کہ کس کا علم زیادہ ہے اور کون کم علم رکھتا ہے۔ بہرحال ایک عالم دین میں جتنی بھی خوبیاں ہونی چاہئیں مفتی صاحب ان تمام خوبیوں سے مالا مال تھے۔ غالباً اب تو مخالفین بھی مفتی صاحب کی اچھائیوں، خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوں گے۔ مفتی صاحب کی ایک خوبی ہی کا میں نے بطور خاص مشاہدہ کیا اور وہ یہ تھی کہ انہیں بہت کم غصہ آتا تھا۔ سوائے ایک آدھ مرتبہ کے میں نے انہیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ لوگ انہیں کھانا کھانے کا وقت بھی نہیں دیتے تھے۔ نماز کا وقت بھی بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ وہ تھک کے چور ہو جاتے تھے۔ پھر بھی وہ لوگوں کے ساتھ مصروف گفتگو رہتے۔ لوگوں کے مسائل، ملکی معاملات پر گفتگو کا سلسلہ چلتا ہی رہتا۔ خود میں نے اس دراز تر سلسلہء گفتگو سے ناراض ہو کر مفتی صاحب کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتا تھا کہ خدا آپ سے مفتی صاحب کی جان چھڑائے۔ اس پر کچھ دوست ناراض بھی ہوئے لیکن میں نے ان سے کہا کہ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ مفتی صاحب ملکی معاملات میں اس قدر الجھے ہوتے ہیں اور آپ سارا وقت ان کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ باتیں پوچھتے رہتے ہیں لیکن مفتی صاحب کبھی کسی کو یہ نہیں کہتے تھے کہ تم چلے جاؤ۔

میں آپ سے یہ عرض کروں کہ سیاست میں مفتی صاحب غالباً واحد شخص تھے جن کی

صدارت یا ریاست میں مختلف مکاتب فکر کے لوگ بیٹھ سکتے تھے اور کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے تھے اور یہ مفتی صاحب کی بہت بڑی خوبی تھی۔ ایک عالم دین کا سیاست کے اس مرتبہ تک پہنچنا، مفتی صاحب کے بعد مجھے محل نظر دکھائی دیتا ہے۔ میری زندگی سے پہلے تو مجھے علم نہیں کہ کوئی ایسا شخص سیاست میں ہوا ہو۔ تاہم میں نے اپنی زندگی میں مفتی صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا جس پر ہر شخص اعتماد کر سکے اور وہ اعتماد کو نبھا سکے۔ سیاست میں ایک مرحلہ ایسا بھی ہوتا ہے جس میں بدقسمتی سے بے رحمی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ بے رحمی یوں کہ بھائی بھائی کا لحاظ نہیں کر سکتا۔ باپ بیٹے کا لحاظ نہیں رکھتا۔ مگر مفتی صاحب اپنی دینی اور اخلاقی اقدار اور اپنی قدر و منزلت کی وجہ سے اس معاملہ میں وہ پوری کوشش کرتے کہ سیاست میں بے رحمی کا یہ عنصر نہ آنے پائے۔ دیگر سیاست دانوں کے نزدیک یہ خوبی کی بات بھی ہو سکتی ہے اور برائی کی بھی۔ کیونکہ اسے ہر طرف کھینچا جا سکتا ہے۔

آپ کے علم میں ہے کہ کالعدم پاکستان قومی اتحاد سے کچھ جماعتیں علیحدہ ہوئیں ان میں سے بطور خاص میں کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کی علیحدگی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے اپنے جتنے مطالبات پیش کیے ان میں سے ایک مفتی محمود کی صدارت چھوڑنا بھی شامل تھا۔ چونکہ یہ معاملات اخبارات میں زیادہ تفصیل کے ساتھ شائع نہیں ہوئے اور نہ ہی زیر بحث آئے۔ اس لیے میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ عرض کر رہا ہوں کہ مفتی صاحب نے بذات خود کئی مرتبہ کہا، ہماری میٹنگوں میں بھی یہ بات بارہا زیر بحث آئی لیکن ایک بار بھی مفتی صاحب نے یہ نہیں کہا کہ چونکہ میں صدر منتخب ہو گیا ہوں لہٰذا مجھے عہدہ صدارت سے علیحدہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرے وقار کا سوال ہے وغیرہ۔ انہوں نے ہر مرتبہ یہی کہا کہ اگر وہ اس بات پر راضی ہوتے ہیں تو میں یہ منصب چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تنہائی میں انہوں نے ویسے ہی کہا کہ میں ترمذی شریف کی شرح لکھ رہا ہوں اور وہ مکمل نہیں ہو پائی ہے۔ میرا مزاج بھی یہ نہیں ہے کہ میں ہمہ وقتی سیاست میں رہوں۔ میں ایک

وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سیاست میں آ گیا تھا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے اس ادھورے کام کو مکمل کر ڈالوں کیونکہ اس کی سیاست سے زیادہ اہمیت ہے۔ چنانچہ سہالہ کیمپ جیل میں جتنا وقت بھی ملتا وہ ترمذی شریف کی شرح لکھتے تھے۔

ہم نے ان سے کئی مرتبہ کہا کہ آپ عہدۂ صدارت چھوڑنے کا بار بار کیوں ذکر کرتے ہیں۔ آپ کو منتخب کیا گیا ہے کالعدم قومی اتحاد کے ارکان نے آپ کو منتخب کیا ہے۔ آپ یوں خود بخود علیحدہ ہو کر ارکان کا حق نہیں چھین سکتے۔ لیکن ان کا جواب ہر مرتبہ یہی ہوتا کہ اگر اس سے تلخی کم ہوتی ہے تو میں یہ عہدہ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ وہ دیوبندی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اکابر میں شامل ہیں۔ تاہم میں نے اپنی رفاقت کے دوران کبھی ان کی گفتگو میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث وغیرہ کا ذکر نہیں سنا۔ انہیں کبھی اس نوعیت کے اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مفتی صاحب کے کردار کی باریکیوں کا مشاہدہ اس امر سے بھی ہوتا ہے۔ جب پاکستان میں قائم سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے آزاد کشمیر میں داخلہ کا مرحلہ آیا اور وہاں جماعتیں بننی شروع ہو گئیں۔ اگرچہ دینی جماعتیں تو مختلف ناموں سے پہلے ہی کام کر رہی تھیں لیکن ان کا پاکستان میں قائم جماعتوں کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا، وہ ان جماعتوں کا حصہ نہیں تھیں۔ بعد ازاں وہاں کالعدم پیپلز پارٹی بن گئی اور ان کی دیکھا دیکھی کم و بیش تمام جماعتوں نے اپنی تنظیمیں وہاں بھی قائم کر لیں۔ اس موقعہ پر کالعدم قومی اتحاد نے فیصلہ کیا کہ آزاد کشمیر میں کوئی جماعت براہ راست کام نہیں کرے گی۔ بلکہ ان کی نمائندگی مسلم کانفرنس کرے گی۔ اس کے باوجود کچھ جماعتیں وہاں کام کرتی رہیں۔ آزاد کشمیر میں قائم ایک سیاسی جماعت نے مفتی صاحب پر بہت زور دیا کہ مفتی صاحب ان کو اپنی جماعت کے حصہ کے طور پر قبول کر لیں لیکن مفتی صاحب نے ایسا کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ مطالبہ کرنے والے اپنے بہت سے عزیز دوستوں اور شاگردوں کو ملنے سے بھی انکار کر دیا اور

کھل کر کہا کہ انہیں وہاں مسلم کانفرنس کا ہی ساتھ دینا چاہیے۔

مفتی صاحب کشمیر کی آزادی، کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے مسئلہ پر اور آزاد کشمیر میں منتخب حکومت قائم کرنے کے معاملہ میں واضح اور دوٹوک رائے رکھتے تھے۔ مفتی صاحب کے متعلق سردار سکندر نے ان کی یہ بات بتائی کہ جب مفتی صاحب کے پاؤں کے انگوٹھے کا اپریشن ہوا تو انہوں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ میرے پاؤں کا آپریشن بے ہوش کر کے نہیں کرنا۔ سردار سکندر کہتے ہیں کہ کیا آپ کو آپریشن کے دوران کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ مفتی صاحب نے جواب دیا ”تکلیف تو بہت ہوئی لیکن میں پٹھان تھا۔ ایک مرتبہ کہہ بیٹھا کہ بے ہوش نہیں کرو پھر اسی پر ڈٹا رہا۔“

سردار سکندر نے مجھے یہ بات بتائی کہ جب مفتی صاحب وزیر اعلیٰ تھے تو انہوں نے تنخواہ نہیں لی۔ انتخابی مہم کے دوران ہم نے چاہا کہ تنخواہ نہ لینے کے مسئلہ کو سٹیج سے لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ مفتی صاحب نے یہ کہتے ہوئے سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ تنخواہ نہ لے کر میں نے کسی پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنے طور پر کیا تھا۔ اپنی اس خوبی کو انتخابی مہم کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہ دینا یقیناً مفتی صاحب کا ہی حصہ تھا۔

مفتی صاحب نے جب بلوچستان کی مخلوط حکومت کو برطرف کرنے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے صوبہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا تو بھٹو صاحب نے مفتی صاحب کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی اور مجھ سے بھی کہا کہ دیکھو مفتی صاحب نے کتنی بڑی غلطی کی ہے کہ ولی خان کی وجہ سے وزارت چھوڑ دی ہے۔ مفتی صاحب کے کچھ اپنے دوست بھی ان سے ناراض ہو گئے جن کا تعلق انہی کی جماعت سے تھا۔ میں نے مفتی صاحب سے ان کے اس فیصلے کی وجہ دریافت کرنے کی خاطر ان سے پوچھا کہ آپ وزارت کے اندر رہتے ہوئے اسلام کی زیادہ خدمت کر سکتے تھے۔ باہر نکل کر تو آپ اسلام کی کوئی خدمت نہیں کر سکیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مفتی صاحب نے میرے استفسار کے جواب میں بڑی گہری بات کہی۔ جو

بنیادی کردار کی بات ہے۔ کہنے لگے کہ جو آدمی بدعہد ہو وہ کیا اسلام کی خدمت کر سکے گا۔ ہم نے ان کے ساتھ عہد کیا تھا میں اگر عہد توڑ دیتا تو کیا اسلام کی خدمت کر سکتا تھا اور بے شمار بد عہدیاں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس عہد کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔

بعض اوقات ہمیں یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ مفتی صاحب کا جھکاؤ بائیں بازو کی جانب ہے کیونکہ ولی خاں صاحب اور ان کے کیمپ کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ اگر وہ بائیں بازو کے نہیں ہیں تو بھی سیکولرسٹ ضرور ہیں۔ خدا جانے ان کی پارٹی کا موقف کیا ہے جس کا مجھے علم نہیں ہے لیکن ان کی رفاقت میں جوں جوں وقت گزرا ہم نے محسوس کیا کہ مفتی صاحب اس سلسلے میں واضح رائے رکھتے ہیں۔

بعض لوگ قیام پاکستان سے قبل مفتی صاحب کے کانگریس کے ساتھ تعلق کی بنیاد پر طرح طرح کی باتیں بھی بناتے رہے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی پاکستان کے متعلق سوچ پر ہمیں ذرا سا شک بھی ہو جائے تو ہم ان کے ساتھ بیٹھنا ہی پسند نہیں کرتے خواہ وہ کسی بھی مرتبے کے لوگ ہوں۔ ہمارے لیے تو ایک لکیر کھینچ جاتی ہے۔ جس سے آگے ہم جا ہی نہیں سکتے۔ مفتی صاحب کے ساتھ جتنا گہرا تعلق رہا مجھے ان کے دل میں پاکستان کی محبت اسلام کی محبت ہم جو اس کے دعویدار ہیں ہمارے مقابلہ میں زیادہ ہی نظر آئی۔ ساری عمر سیاست میں گزری ہے اور یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جنہیں کوئی چھپا نہیں سکتا۔ مفتی صاحب کے کسی طور طریقے یا بات سے اس کا شائبہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ پاکستان سے ان کی محبت کسی بھی پاکستانی سے کم ہے یا وہ پاکستان کی آزادی، سالمیت استحکام اور دفاع کے لیے اتنی قربانیاں دینے کے لیے تیار نہیں ہیں جتنی کوئی اور شخص دینے کے لیے تیار ہوگا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ مفتی صاحب ایک کوہ گراں تھے۔

سیاست بذات خود کسی رنگ، نسل، زبان، تجربے کی محتاج نہیں ہے۔ بلکہ سیاست بذات خود ایک فن ہے انگریزی زبان بولنے والوں، ان کا طرز تمدن رکھنے والوں کی ایک خاص قسم کی

سیاست ہے جس کی وجہ سے یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ مغربی انداز فکر کی سی سیاست ہی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ جب مغربی تہذیب صفر سے نیچے تھی اس وقت بھی مسلمان اور دیگر ممالک میں سیاست آسمان پر تھی۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ جو تاثر عام ہو گیا ہے کہ سیاست کے لیے مغربی تعلیم اور تہذیب ہونا ضروری ہے ایسا انگریز کے تسلط کی وجہ سے ہوا۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ دینی تعلیم رکھنے والے لوگوں نے ایک زمانے تک سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھا۔ اس کے قریب تک نہیں ہوئے۔ اس طرح جو دو کیمپ قائم ہوئے اس سے یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ سیاست حق ہے ان لوگوں کا جو مغربی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بے ایمانی، فریب اور فتنہ پیدا کر سکیں۔ مغرب میں یہ بات واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے کہ سیاست دان اپنے لوگوں کو دھوکہ نہیں دیتا لیکن بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ہاں بڑا سیاست دان وہی سمجھا جاتا ہے جو اپنوں کو دھوکہ دے کیونکہ دوسرے تو دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ مفتی صاحب ایسے صاف ستھرے کردار کے حامل تھے کہ وہ نہ دھوکہ کھاتے تھے نہ کسی کو دھوکہ دیتے تھے۔

سیاست کا ایک اور پہلو ہے جس میں تشنگی کا احساس ہم سب لوگوں میں پائیں گے اور وہ یہ کہ ہمارے ہاں ہمہ وقتی سیاست دان کم ہیں جس کی وجہ سے سیاسی مسائل پر ان کا مطالعہ کم ہوتا ہے۔ خاص طور پر اندرون ملک مسائل کا جس میں دفاعی، اقتصادی، انتظامی سب شامل ہوتے ہیں۔ اس ایک کمی کے علاوہ مفتی صاحب ہمارے سیاستدان علماء میں ایک ایسے شخص تھے جنہیں سیاست دان بڑی آسانی سے قبول کر سکتے تھے۔ اس اعتبار سے میری رائے میں بہت مشکل بات ہو گی کہ کوئی دوسرا شخص مفتی صاحب کے مقام تک پہنچے اور سیاست دان نہایت آسانی خوشی اور محبت کے ساتھ قبول کر لیں مجھے ان کی سیاست میں مغربی تعلیم نہ ہونے کی بنا پر کوئی کمی دکھائی نہیں دی۔

دینی تعلیم ہمیں سیاست سے دور نہیں رکھتی اور ایک سیاست دان کے لیے خاص طور پر ایک مسلمان ملک کے سیاست دان کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ دینی علم کا اچھا خاصا ذخیرہ

رکھتا ہو- بے شک وہ بہت بڑا علامہ نہ ہو لیکن اس کا دینی علم کم و بیش ہونا چاہیے- اس کے ساتھ ساتھ سیاست کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک ملک کے انتظامی امور سے تعلق رکھنے والے جو معاملات ہیں ان کا بھی علم ہو- یعنی صرف دینی علم اور تقویٰ کی بنیاد پر بھی کوئی شخص سیاست دان نہیں کہلا سکتا۔ سیاست دان کو ان علوم پر دسترس ہونی چاہیے جو سیاست سے تعلق رکھنے والے امور ہیں- جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کارِحکومت سے تعلق رکھنے والے امور میں اگر ان کا سو فیصد نہیں تو بھی ان کا بنیادی علم بھی شامل ہو جیسا کہ مفتی صاحب کا تھا- تو وہ یقیناً تقویٰ، سچائی، دیانت، امانت کے معاملہ میں سب سے بہتر ہوگا- ہم نے مفتی صاحب کے گھر جا کر دیکھا کہ ان کے کچے مکان ہیں- حالانکہ اگر وہ چاہتے تو وہ وزیر اعلیٰ اور کالعدم قومی اتحاد کے صدر نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے مکانات کو پختہ بنا سکتے تھے لیکن انہوں نے پوری زندگی ذاتی معاملات کے اس پہلو پر توجہ نہ دی- دنیا کے بے شمار لیڈروں میں یہ خوبیاں رہی ہیں لیکن ہمارے ہاں اس کو برا سمجھا جاتا ہے- ان کی جگہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے لیڈر شپ کا معیار یہ ہو گیا ہے کہ کاریں ہوں، بیگمات ہوں، کوٹھیاں ہوں کروفر ہو، جھوٹ خوب بولتا ہو، دھوکہ دیتا ہو، تب وہ لیڈر ہو سکتا ہے گویا وہ ان تمام منفی خصائص کا مجموعہ ہو- حالانکہ اس کے برعکس سیاست دان کو عام آدمی سے زیادہ متقی پرہیزگار ہونا چاہیے- تبھی اسے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے-

ہمارے ہاں ایک بڑا المیہ یہ ہوا کہ جو لوگ حکومت میں گئے حکومت میں شمولیت سے قبل اکثر و بیشتر ان کا سیاست سے علم واجبی سا ہی تھا- بلکہ وہ محض ایک حلقہء انتخاب سے منتخب ہو کر حکومت میں شریک ہو گئے- یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ محض منتخب ہو جانا سیاست نہیں ہے سیاست بہت وسیع بات ہے جس کے چار پانچ بنیادی معاملات پر وہ کوئی علم نہیں رکھتے تھے- نتیجہ یہ تھا کہ جب یہ لوگ حکومت میں گئے تو بنیادی علم نہ رکھنے والے لوگ اس بیوروکریسی سے چاہتے تھے کہ وہ اپنی مہارت فن کے ساتھ کام کرتے اور ناموری ان کی ہو جو یہاں سے گئے تھے- ایسا ہو نہیں سکتا تھا- طبعاً فطرۃً یہ بات ناممکن تھی-

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب لوگ ناکام ہوئے۔ اس لیے حکومت میں جانے سے قبل کسی شخص کو بھی حکومت کا بہت سا علم ہونا چاہیے، اسے شریک حکومت ہونے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

مفتی صاحب کی وفات کی خبر میں نے مکہ مکرمہ میں سنی جہاں ہم ان کا انتظار کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے جس دن انہیں پاکستان سے روانہ ہونا تھا وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ میں نے مکہ مکرمہ سے دس دن پہلے انہیں بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ آ جائیں۔ لیکن پاکستان سے روانہ ہونے میں انہیں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ مفتی صاحب کی وفات کی خبر نے مجھ پر وہی اثر کیا جو سقوط مشرقی پاکستان نے کیا تھا۔

یہ تاریخ کا بڑا دردناک پہلو ہے کہ تاریخ شخصیات کو پیدا کرتی ہے اور وہ تاریخ بناتے ہیں۔ یہ بات انسانی بس میں نہیں ہے کہ وہ مفتی محمود جیسی بے بدل شخصیات کو پیدا کرے۔ بہرحال طریقہ یہی ہے کہ ایک شخصیت کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے خلاء کو اجتماعی طور پر پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی ملک میں دنیا بھر کے پروفیشنل پیدا کیے جا سکتے ہیں لیکن سیاست دان پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا اب یہ خلاء بہت سے لوگوں کو مل کر پورا کرنا ہوگا۔

سردار عبدالقیوم خان
سابق صدر آزاد جموں و کشمیر

مفتی صاحب قوم کی کشتی کے ناخدا تھے

کسی سے نہ دبنے والے دنیا اور دولت کے خزانوں کو ٹھکرانے والے حضرت مولانا الحاج مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ کی رحلت تمام ملت اسلامیہ کے لیے ایک ناقابل تلافی سانحہ ہے۔ محراب منبر پر تو اسلام کا نعرہ الحمد للہ بلند ہوتا رہا لیکن سلطانِ جابر اور ایوان اسمبلی اور پاکستان کے مختلف ادوار میں جس جرأت کے ساتھ ارباب اقتدار کے سامنے اسلام کا نعرہ بلند کیا۔ یہ شان انہی کی تھی۔ ان کے اظہار حق میں نڈر ہونے کی ہی وجہ تھی کہ بڑے سے بڑے جابر حکمران ان کے سامنے بچوں کی طرح جھکے رہتے اور حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ شیر خوار ہو کر ان کے سامنے شاہانہ لہجہ میں گرجتے رہا کرتے۔ انگریز نے علماء کی تذلیل کی تھی اور دنیا کی نظروں میں علماء کو حقیر گردانا اور یہ کسی کے تصور میں بھی نہ تھا کہ محراب اور منبر کے بوریہ نشین حکومت و دنیوی معاملات کو بھی سلجھا سکتے ہیں۔ مگر دو صد سالہ گمراہ کن پروپیگنڈہ کو حضرت مفتی صاحب نے نو ماہ کی حکومت میں زائل کر دیا۔ دنیا کو بتا دیا کہ مولوی بوریہ نشین حکومت کو بہتر طریقہ پر چلا سکتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کی حکومت کے زمانہ میں مکمل امن و امان تھا۔ نہ انہوں نے دفعہ ۱۴۴ اور نہ کرفیو نافذ کیا۔ ان کے دور حکومت میں کبھی گولی کسی پر نہ چلی۔ عام ضروری اشیاء کی کثرت تھی۔ اس بوریہ نشین نے کرسی پر بیٹھ کر وزیر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہو کر شاہی میں فقیری اور اسلامی حکومت کا نمونہ پیش کیا اور آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولوی حکومت چلا سکتا ہے۔ بوریہ نشین کرسی نشین ہو کر اسلام کے بہترین اصول کے مطابق حکومت چلا سکتے

ہیں۔ اسلام کی حقانیت اور صداقت کو ظاہر فرمایا۔ حکومت کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو کر اپنے لیے رہائشی مکان نہیں بنایا۔ اس آخری دور میں خلفائے راشدینؓ کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ آج تمام عالم اسلام اور خصوصاً پاکستان میں علماء کو ایک بہترین مقام حاصل ہے اور لوگ علماء کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ حضرت مفتی صاحب کے اخلاق، فہم اور تدبر اور بہترین کارناموں کا اثر ہے۔ آج سارا پاکستان ایک بہترین مفکر اور لائق قائد سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ عالم یا مصنف مل جائے مگر حضرت مفتی صاحب جیسے مدبر کہاں اور ممکن ہے کہ سیاست دان موجود ہو مگر وہ عالم بھی ہو۔ یہ مشکل ہے۔ الغرض حضرت مفتی صاحب کے کمالات اور خوبیاں اس قدر ہیں کہ دفاتر بھی کافی نہیں ہو سکتے۔ خداوند کریم اس امت کی حفاظت و بھلائی کے لیے حضرت مفتی صاحب مرحوم کے قائم مقام کو عطا فرمائے۔ آج ہم بہت بڑے عالم دین اور بڑے سیاست دان سے محروم ہو گئے۔ یہ صدمہ کل قوم کا صدمہ ہے۔ رب العزت قوم کی رہنمائی کے لیے نائب عطا فرما دے۔ حضرت مفتی صاحب کے ذاتی کمالات بے شمار ہیں۔ مگر قوم، پاکستان اور علماء کے لیے جو خدمات کی ہیں وہ بھی لاتعداد ہیں۔ دین اسلام کے لیے سب چیزوں کو قربان کرنے والے تھے اور علمی کمالات کے جامع تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے دفاتر بھی پورے نہیں ہو سکتے۔

مولانا مفتی محمود کی موت ملک و ملت کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ موجودہ قومی اور بین الاقوامی حالات میں قوم کو ان کی رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔

مولانا مفتی محمود کی موت ایک عظیم دور کی موت ہے۔ ان کا شمار برصغیر کے ممتاز دینی اور قومی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ مجدد الف ثانی حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید کے اصولوں کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

وہ موجودہ قومی حالات میں قوم کی کشتی کے ایسے ناخدا تھے جو سینکڑوں میل طوفان کی نشاندہی کرتے تھے۔ انہوں نے ہر نازک موقع پر قوم کی رہنمائی کی۔ حتیٰ کہ جب مشرقی

پاکستان کی علیحدگی کے لیے تحریک زوروں پر تھی تو انہوں نے مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کو آخری وقت تک متحدہ پاکستان کے لیے اپنے موقف میں لچک پیدا کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے ملک میں ہر دینی اور سیاسی تحریک کی قیادت کی اور ہمیشہ اگلی صفوں میں رہے۔

صوبہ سرحد میں اپنے دور اقتدار میں درویشانہ روایات قائم کیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے ہر مکتبہ فکر کے علماء سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں نے ان کا ہمیشہ احترام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی قوم کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ مولانا مفتی محمود جیسے لوگوں کو لوگ ناموں سے نہیں کارناموں سے پہچانتے ہیں۔

چودھویں صدی ہجری پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالیں تو قائدین ملت اور رہنمایان قوم کی ایک طویل قطار نظر آتی ہے جنہوں نے انتہائی نازک اور مشکل حالات میں قوم کی قیادت و رہنمائی کا نازک فریضہ سرانجام دیا۔ اس جماعت کی آخری صفوں میں مولانا مفتی محمود کا نام بھی آتا ہے جو چودھویں صدی کا سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم زمانی اعتبار سے آخری صف میں نظر آتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی بلندی، بلند نگاہی، عزم و استقامت اور وسعت قلبی کے اعتبار سے وہ پہلی صف کے رجال کار میں شامل تھے اور انہوں نے اپنی مکمل زندگی کے شب و روز میں اپنے کردار اور حسن عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ارباب عزیمت کی آبرو اور اس مقدس قافلہ کے مشن کے امین و وارث تھے۔

میرا مرحوم سے تعلق خاطر بہت پرانا تھا، جب وہ مدرسہ قاسم العلوم کے شیخ الحدیث اور مفتی و مدرس تھے۔ اس وقت بھی دیکھا اور جب وہ قیادت کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے کہ پوری پاکستانی ملت نے انہیں اپنا قائد اور امام تسلیم کیا۔ اس وقت بھی دیکھا نہ صرف دیکھا بلکہ مل کر ایک عرصہ تک کام بھی کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج جب اچھے اچھے باہمت لوگ اپنے ذاتی عوارض یا پھر حالات کی ستم رانیوں کا شکار ہو کر خاموش ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا پھر بھی

سرگرم عمل رہنا ان کی ایک ایسی کرامت تھی جو خال خال لوگوں کو ہی نصیب ہوا کرتی ہے۔

ایک شخص جو ملت کے اتحاد و اتفاق کے لیے چلا اور صبر آزما محنت کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ گیا ہو کہ اس نے اپنی جماعت تک کے مقابلہ میں ملی اتحاد کو ہی اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہو۔ اس کی عظمت کا کیا ٹھکانہ اور پھر یہ ساری کاوش و محنت اس حال میں ہوتی رہی کہ ان کی صحت خطرناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ علاج اور آرام کی شدید ضرورت کے باوجود انہوں نے سرگرمی سے اپنا کام جاری رکھا اور موت سے جس حال میں ملاقات ہوئی وہ سب کو معلوم ہے، ایسے عظیم لوگ قوموں کی زندگی میں انقلابی رول ادا کرتے ہیں اور بلا شبہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کا کردار ایک سنگ میل اور نشان منزل ہے جو آنے والی نسلوں کو جہاد و خودداری اور عزم و استقامت کا راستہ دکھاتا رہے گا۔

مولانا عبیداللہ انور

اسلام کا تصور قیادت اور مفتی محمود

تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں قیادت کا کوئی ایسا تصور کبھی موجود نہیں رہا جس کی وابستگی دین کے ساتھ نہ ہو اور اس معاملہ میں جب ہم تاریخ کا حوالہ دیتے ہیں تو اس سے مراد صرف انسان کی اپنی مرتب کردہ تاریخ نہیں بلکہ خود خالق کائنات کی بیان کردہ تاریخ ہے۔ جس کا نقطہ آغاز اولین مسلمان حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور دنیا میں ان کا نزول ہے۔

قرآن کریم نے انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے قیادت کا جو انسانی پیکر ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک مختلف انبیاء کرام کے کردار کی صورت میں ہمارے سامنے لایا گیا۔ قرآن ہدایت و رہنمائی کے معاملہ میں نتائج کے اختلاف کے باوجود ان تمام انبیاء کو کامیاب قرار دیتا ہے اور ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی فرق نہ کرو اور پھر ساتھ ہی فیصلہ بھی صادر کرتا ہے کہ اس گروہ انبیاء کا سلسلہ نبی آخر الزمان حضرت محمدؐ پر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ قیادت کا آخری مکمل اور اعلیٰ ترین نمونہ ہیں اور اب ابد تک جس کسی کو ہدایت و رہنمائی مطلوب ہے وہ صرف اسی ایک نمونہ قیادت کی طرف دیکھے۔

خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس آخری نمونہ قیادت ہی کا پرتو ہیں اور چونکہ ان کی زندگی حیات طیبہ سے مشابہت و مطابقت اور اس کے اتباع کے معاملہ میں پوری امت کے اندر سب سے افضل و برتر ہے اور اسے براہ راست حضور اکرمؐ سے تربیت و تعلیم کی عظیم سعادت میسر آئی ہے اس لیے نبیؐ کے بعد صحابہ کرام اور بالخصوص خلفائے راشدین

قیادت کا بہترین نمونہ ہیں۔ انہیں بھی قرآن کریم اور زبان رسالتؐ نے کامیابی کی سند عطا کی ہے۔

خلافت راشدہ کے عہد مسعود کے بعد قیادت کا یہ تسلسل ٹوٹ نہیں جاتا اس معاملہ میں بھی ہمیں اندھیرے میں نہیں چھوڑا گیا اور خود حضور اکرمؐ کی زبان مبارک سے یہ فیصلہ قیامت تک کے لیے صادر ہو جاتا ہے کہ

العلماء و رثة الانبیاء

علماء انبیاء کے جانشین ہیں۔

یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ حضورؐ نے علماء کو اپنا جانشین نہیں بلکہ انبیاء کا جانشین قرار دیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ حقیقتاً کسی ایک نبی کے نہیں پورے گروہ انبیاء کے مشترکہ ورثہ کو سنبھالنے والے ہیں۔ ہر نبی کا اپنا اپنا ورثہ مختلف رہا ہے کسی کو حضرت یوسفؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی طرح نبوت کے ساتھ ساتھ تخت و تاج بھی عطا ہوا۔ کسی کو حضرت نوحؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی طرح محض دعوتِ دین ہی کا مشن سونپا گیا اور دنیوی جاہ و منصب سے دور رکھا گیا اور کسی کو حضرت صالحؑ اور حضرت شمعون کی طرح اس راہ میں جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا۔ ان سب کے حالات و واقعات ان کے مادی اسباب و وسائل اور اپنے اپنے معاشرے میں ان کے ظاہری مقام ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں لیکن تین چیزیں ان سب کا مشترک سرمایہ رہی ہیں۔ دعوت دین کا مشن، وحی الٰہی کے ذریعہ عطا ہونے والا علم اور بلند و پاکیزہ کردار، حضور اکرمؐ جب علماء کو وارث انبیاء قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب دعوتِ دین کے مشن اور علم و کردار کے اسی مشترکہ ورثہ کا تسلسل اور اس کی حفاظت ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے آج تک حکومت کی سطح پر اسلام مختلف کیفیات سے دو چار رہا ہے۔ اسے بنی امیہ اور بنو عباس کے دور میں ملوکیت و آمریت کا بھی سامنا کرنا پڑا اور اسی سطح سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے درویش صفت حکمران بھی نصیب ہوئے۔ جن کا ڈھائی سالہ عہد حکومت ۱۶۱ سال کے فاصلے کے باوجود خلافت راشدہ میں شمار

کیا گیا۔ مسلمان کو بڑے بڑے جابر و قاہر اور ظالم و سفاک بادشاہوں سے بھی واسطہ پڑا اور انہی بادشاہوں کے بطن سے اورنگ زیب عالمگیر جیسے عالم دین کاتب قرآن، اور ٹوپیاں سی کر روزی کمانے والے ناصر الدین جیسے فقیر منش فرمانروا بھی میسر آئے لیکن اقتدار کی بلند سطح پر ان ادلتے بدلتے کرداروں کے برعکس ہمیں علماء کی صفوں میں اس قیادت کا تسلسل برقرار نظر آتا ہے جو علم، کردار اور دعوت دین کے مشن کی وارث بنائی گئی تھی۔ نبی آخری الزمانؐ کی امت پر نہ ایسی کوئی صبح نمودار ہوئی نہ ایسی کوئی شام آئی جب وہ اس قیادت سے محرومی کی حالت میں رہی ہو۔

قیادت کے اس تسلسل کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہمارے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اپنی وفاداری اور اطاعت گزاری کا رشتہ ہمیشہ اسی دینی قیادت سے باندھے رکھا ہے۔ خلافت راشدہ تک علم، کردار، دعوت دین اور فرمانروائی کے جملہ عناصر ترکیبی ایک ہی ذات میں مجتمع رہے اس لیے وفاداری کا مرکز بھی ایک رہا لیکن عہد بنوامیہ میں جب یہ عناصر منتشر ہوئے تو اطاعت و وفاداری کی وحدت بھی برقرار نہ رہ سکی۔ طویل عرصے تک جب درگریز کی کشمکش جاری رہی اور پھر ایک دو عملی (Dichotomy) نے سمجھوتے کی صورت نکال لی۔ قتل و خونریزی سے تنگ آ کر لوگوں نے صلح و جنگ، نظم و نسق، ریاست اور دوسرے متعلقہ امور کی حد تک وقت کے حکمران کی اطاعت کو اپنا شعار بنالیا اور خالص دینی امور میں علماء سے رشتہ وفاداری استوار رکھا مگر اس دو عملی کے باوجود یہ ترتیب اپنی جگہ برقرار رہی کہ اولین اطاعت صاحب فتویٰ کی ہے اور ثانوی اطاعت حکمران کی۔ ان دونوں کے درمیان جب کبھی تصادم ہوا امت نے حکومت کا ساتھ چھوڑ کر علماء کا ساتھ دیا۔ صف آرائی کی نوبت آئی تو امت علماء کے پرچم تلے کھڑی نظر آئی اور جب کبھی علم و کردار اور دعوت دین کے مشن کا اتصال مسند حکومت سے ہوگیا امت کے اندر وحدت اطاعت کا رویہ بھی بحال ہوگیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور حکومت میں یہ صورت پیدا ہوئی تو دو عملی بھی رخصت ہوگئی۔ ظلم، جہل اور جبر و استبداد نے جب بھی اقتدار پر قبضہ کیا۔ امت نے اس سے رشتہ وفاداری توڑ

لیا اور علماء کی قیادت میں اس کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔

اس حقیقت کا اظہار ایک تاریخی واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ مشہور محدث و فقیہ حضرت عبداللہ بن مبارک ایک بار بغداد تشریف لائے تو پورا شہر ان کے استقبال کے لیے امڈ آیا گلی کوچوں اور شاہراہوں میں ہلچل کا شور بلند ہوا تو ملکہ زبیدہ نے جھروکے سے یہ منظر دیکھا اور کنیزوں سے پوچھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ لوگ دیوانہ وار ایک ہی سمت میں کہاں جا رہے ہیں؟ جب انہیں بتایا گیا کہ مشہور محدث حضرت عبداللہ بن مبارک آج بغداد تشریف لا رہے ہیں لوگ شہر سے باہر جا کر ان کے استقبال کے لیے جمع ہو رہے ہیں تو وہ اس جوش و خروش اور عقیدت مندی کے جذبات پر حیران رہ گئی اور جب اس نے کچھ دیر بعد دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی سواری لاکھوں عقیدتمندوں کے جلوس میں کسی بادشاہ کی سواری سے زیادہ تزک و احتشام سے گزر رہی ہے تو زبیدہ نے ہارون الرشید کو جا کر طعنہ دیا کہ تم تو کہتے ہو کہ بغداد اور پوری مسلم دنیا پر تمہاری حکمرانی ہے مگر جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ اصل حکمرانی تمہاری نہیں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی ہے۔ تو ہارون نے مسکرا کر اس کے سوا کچھ نہ کہا کہ

> ”ہاں! جسموں پر ہماری حکومت ہے اور دلوں پر حضرت عبداللہ بن مبارک کا راج ہے۔“

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ہوں، حضرت ابو حنیفہؒ حضرت امام احمد حنبلؒ ہوں یا حضرت امام ابن تیمیہؒ یہ سب اپنے اپنے دور کے حاکمان قلوب و اذہان ہیں اور ان کے ہم عصر حکمران محض کرسی اقتدار کے قابضین۔ تاریخ کے ایک ایک عہد سے گزر ہوتے ہوئے برصغیر میں انگریزوں کے خلاف جہاد اور تحریک آزادی میں علماء کے کردار کے قریبی زمانہ تک آیئے اور تاریخ کا دیانتدارانہ جائزہ لے کر دیکھیے کہ امت کو اصل قیادت کس نے مہیا کی لیکن اس مرحلے پر آنے سے قبل میں ایک بار پھر آپ کو تاریخ انسانیت کے نقطہ آغاز پر واپس لوٹ آنے اور تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کی زحمت دوں گا۔

قرآن کریم نے جہاں انبیاء کرام کی صورت میں قیادت کا بہترین نمونہ ہمارے سامنے رکھا اور اسے مختلف حالات و کیفیات میں برسر عمل دکھا کر ہماری رہنمائی فرمائی وہاں بدترین قیادت کے نمونے بھی ہماری نگاہوں کے سامنے رکھ دیے ہیں جس طرح رات کی تاریکی کے بغیر دن کے اجالے کی قدر و حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی اسی طرح انبیاء کرامؑ کے مشن اور انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ان کے مقام کی اہمیت کا اندازہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک ان کے مقابلے میں پست اور ذلیل کردار بھی سامنے نہ لائے جاتے۔ تاریخ انسانیت میں فرعون کے بغیر حضرت موسیٰ کا کردار اور کفارِ مکہ کے بغیر حضرت محمدؐ کا کردار سمجھنا مشکل ہے۔ قرآن نے فرعون، ہامان، قارون، شداد اور اپنی خدائی کے زعم میں یا دوسروں کی خدائی کے وہم میں مبتلا حکمرانوں، سرداروں اور گمراہ لوگوں کے جو انفرادی اور اجتماعی کردار ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ وہ بھی اتفاق سے تاریخ کا سفر طے کرتے ہوئے اہل حق کا تعاقب کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن ان میں اور اہل حق میں ایک فرق بھی ہے۔ یہ ڈوبتے اور ابھرتے رہے ہیں۔ ان کی قیادت کا تسلسل کبھی قائم نہیں رہا۔ ان کے اپنے عہد میں بھی لوگوں کے دل کبھی ان کے ساتھ نہیں رہے۔ ہاں ان کے جسم زنجیروں میں جکڑے گئے اور ان کی گردنیں تلوار سے زیر کر لی گئیں لیکن یہ کام قیادت کا نہیں دجل و فریب اور جہالت و شقاوت کا ہے قیادت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ لوگوں کا رشتہ اطاعت و وفاداری قلب میں پیوست ہو اور ذہن اس پر کسی مزاحمت کے بغیر آمادگی کا اظہار کرے۔ زور اور زبردستی سے یا عہدے منصب اور مفادات کی سنہری زنجیروں میں جکڑ کر لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لینا اور ان سے حسب منشاء اپنا کام لینا قیادت نہیں ہے۔ اس طرز عمل کے ساتھ اقتدار کی قوتوں پر قبضہ کر لینے والوں کو قائد کا خطاب دینا اس لفظ کی آبروریزی ہے۔

تاریخ میں یہ اعزاز صرف اعلیٰ اخلاق علم و کردار اور دعوت دین کے مشن کی حامل قیادت ہی کو حاصل رہا ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے مفقود نہیں ہوئی۔ اس کا تسلسل قائم و برقرار ہے۔ یہ

اقتدار کی مسند پر آئے تو لوگ اپنا رخ اس کی طرف کر لیتے ہیں۔ یہاں سے رخصت ہو کر کسی بوریہ پر آ بیٹھے یا مدرسہ کی زینت بن جائے تو مسند اقتدار سے منہ پھیر کر لوگ اپنا رخ بوریہ نشین کی طرف کر لیتے ہیں۔ اقتدار اس بوریہ نشین سے چھیڑ چھاڑ کی حماقت کر بیٹھے تو لوگ اس کے بلند و بالا قصر اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔ بین الاقوامی اصول اور ضابطے ملک کا قائد خواہ کسی کو قرار دیں لیکن مسلمانوں کے ملک میں اصل قائد وہ ہوتا ہے جو حضرت عبداللہ بن مبارک کی طرح دلوں پر حکومت کرتا ہے۔

برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر کسی فتنہ عقائد کے بغیر حکومت کرتا رہا تو مسلمان اس کا دست و بازو بنے رہے۔ اس کے پوتے اکبر نے ”دین الٰہی“ ایجاد کیا تو علماء نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس پر لعنت بھیجی اور عام مسلمان اس کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ اکبر کے بیٹے جہانگیر نے اس نئے دین کی حفاظت میں سرگرمی دکھائی تو حضرت مجدد الف ثانی اس کی سرکوبی اور ہدایت کے لیے نمودار ہو گئے۔ جہانگیر بالآخر راہ راست پر آیا۔ دربار کا پیدا کردہ فتنہ ایک عالم دین کی کوششوں سے زیر ہوا۔ تاریخ کا رخ بدل گیا اور پھر اسی جہانگیر کے پوتے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں دربار اور مدرسہ کی تقسیم مٹ گئی۔ دین اور دنیا پھر یکجا ہو گئے۔ مغلیہ سلطنت پر زوال آیا اور شراب و شباب اور موت کی نیند سلانے والی شعر و شاعری کے ہاتھوں مسلمانوں کا سفینہ غرق ہوا تو پھر ایک مرد حق نے اٹھ کر قیادت کا حق ادا کیا۔ مرہٹوں نے دہلی پر قبضہ جمایا تو شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو افغانستان سے طلب کر کے اس فتنہ کا سر کچلا اور مسلمانوں کی سلطنت کو مرہٹوں کے قبضے سے نکلوایا۔ پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھایا تو پھر اسی خاندان کی برگزیدہ ہستیوں نے امت کو سہارا دیا۔ حضرت شاہ احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید نے علم جہاد بلند کیا اور پورے ہندوستان میں جہاد کی روح پھونک دی۔ معرکہ بالا کوٹ محض سکھوں ہی کے خلاف ایک مہم نہ تھی بلکہ اس کی پیدا کردہ فضا نے خود انگریزوں کے خلاف جہاد کی ایک عمومی تحریک برپا

کر دی۔ اسی لیے اس تحریک کے خلاف انگریزوں کو بند باندھنے کی فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے ایک طرف جہاد کے خلاف فتویٰ بازی کے لیے قادیانی فتنہ کو جنم دیا اور دوسری طرف عرس، چہلم اور قوالی ہی کو عین اسلام سمجھنے والے جاہل مسلمانوں کے گروہ کو اس تحریک کے رہنماؤں کے خلاف کفر کی توپیں داغنے کے کام پر لگا دیا۔

دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزی استعمار کا دور محکومی شروع ہوا تو پھر خاندانِ ولی اللّٰہی نے آگے بڑھ کر اس سے نجات پانے کی جدوجہد شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز اسی خاندان کے تربیت یافتہ علماء کے فتووں سے ہوا اور پھر اسیر مالٹا حضرت مولانا محمود الحسن کی تحریک ریشمی رومال ہو یا اکابرین دیوبند کی تحریک آزادی ہند، علماء ہی نے مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد کے لیے بیدار کیا۔ انہوں نے ایک طرف مدرسوں کا جال پھیلا کر علم دین کی حفاظت کی، دین کے ساتھ عام مسلمانوں کا رشتہ جوڑے رکھا اور دوسری طرف ان کی غیرت ایمانی کو ابھار کر انہیں غلامی سے نجات پانے کی راہ پر لگایا۔

یہاں اتنی بات واضح کر دوں کہ خواہ مسلم لیگ کے قائدین تحریک پاکستان ہوں یا کانگریس کے قائدین تحریک آزادی ہند، ان دونوں کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کا اصل سہرا علماء کے سر ہے۔ علماء کے اختلاف رائے کا یہ پہلو تو اکثر زیر بحث آتا ہے کہ انہوں نے دو حصوں میں بٹ کر تحریک پاکستان کو نقصان پہنچایا لیکن اس مثبت پہلو پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے کہ حصول پاکستان کی تحریک ہو یا حصول آزادی ہند کی، علماء بحیثیت مجموعی انگریزوں کے کٹر دشمن رہے جبکہ مرہٹوں کی بڑی تعداد، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان انگریزوں کی پشتیبان بنی رہی اور آخر دم تک ان کی چاکری کرتی رہی۔

قائداعظم کے رفقاء میں اگر مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا حسرت موہانی، نواب بہادر یار جنگ (جنہیں علماء میں ہی شمار کرتا ہوں) اور سرحد سے لے کر بنگال تک پھیلے ہوئے ہزاروں علماء شامل نہ ہوتے تو مسلمان اتنی بڑی تعداد میں کبھی ان کی پشت پر

جمع نہ ہوتے اور سرحد کے ریفرنڈم میں کامیابی کا تو سرے سے کوئی امکان نہ رہتا۔ اسی طرح گاندھی اور نہرو کو، جو انگریز کا مقابلہ کرتے ہوئے ڈرے سہمے رہتے تھے اور ہندوستان کے لیے مکمل آزادی کی بجائے ڈومینین کی حیثیت قبول کر لینے پر رضامند تھے۔ اگر مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر علماء کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو ان کی تحریک میں وہ جوش وخروش اور زور وقوت پیدا ہونا ممکن نہ تھا جس کے بل پر آزادی حاصل ہوئی گویا مکمل آزادی علماء ہی کا مطمح نظر تھا اور وہ اس تحریک آزادی کا آغاز کر کے اس کا ہراول دستہ بننے کی سعادت بہت پہلے حاصل کر چکے تھے۔

علامہ اقبال، قائداعظم، لیاقت علی خاں اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں کے بارے میں اتنی بات واضح ہو جانی چاہیے کہ وہ علماء کی صف میں تو شامل نہ تھے لیکن امت نے ان کی قیادت اسلام سے گہری وابستگی کے یقین واعتماد ہی پر تسلیم کی تھی۔ اقبال تو خیر روایتی وضع قطع نہ ہونے کے باوجود ایک عالم اور شارح اسلام کی حیثیت سے معروف تھے اور علماء ہوں یا عام مسلمان سب کے نزدیک غیر متنازعہ شخصیت تھے لیکن قائداعظم بھی جب تک ہندو کی گرفت سے نکل کر مسلمانوں کے پلیٹ فارم پر نہ آئے اور پھر نظریہ پاکستان کی شرح مسلمانوں کے تصورات وعقائد کے مطابق ان کی زبان سے نہ سن لی گئی، انہیں بھی قائد کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔

اس پورے پس منظر سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی قیادت میں اسلام اور علماء کا کیا مقام ہے اور جو شخصیت دین سے ذہنی وقلبی رشتہ نہ رکھتی ہو اس کی حیثیت امت کے اندر کیا ہے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب یہ دیکھیے کہ قائد تحریک نظام مصطفیٰ مولانا مفتی محمود مرحوم پاکستان کے مسلمانوں کی آنکھ کا تارا کیوں بنے اور جب آمریت کے خلاف ایک بھرپور جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا تو قیادت کے لیے سب کی نگاہ انتخاب انہی کی طرف کیوں اٹھی۔

مولانا مفتی محمود کی سیاسی زندگی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کی سیاسی زندگی میں آنے والی تبدیلیاں ہی انہیں مقبولیت کی مختلف سطح پر لانے کا سبب بنی ہیں۔ ان کا پہلا دور

تقسیم ہند سے پہلے کا دور ہے جس میں وہ متحدہ ہندوستان کے علمبردار علماء کی صف میں شامل تھے۔ اس دور میں ان کا مقصد اپنے ہم مسلک ہم مکتب اور اساتذہ کے گروہ سے تعلق رکھنے والے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے ہوا۔ سرحد کے ریفرنڈم میں مولانا عثمانی جیتے اور مولانا مفتی محمود ہارے۔ یہ شخصیات کی نہیں نظریات کی فتح و شکست تھی۔ مولانا مفتی محمود کا دوسرا دور ایوب خاں کی آمریت سے قبل کا دور ہے۔ اس میں وہ صوبہ سرحد کی حدود سے بلند ہو کر قومی رہنماؤں کی صف میں شامل ہوئے اور تحریک جمہوریت میں اپنے جرأت مندانہ کردار کی وجہ سے عوام کی توجہ کا مرکز بنے لیکن تحریک پاکستان کی مخالفت اور کمیونسٹ و سوشلسٹ حلقے سے رفاقت نے انہیں ایک حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ مولانا کی سیاسی زندگی کا تیسرا دور ایوب خاں کے بعد سے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کامیابی تک کا دور ہے۔ مولانا نے اس دور میں بھی کمیونسٹ اور سوشلسٹ حلقے سے اپنی رفاقت کا رشتہ برقرار رکھا۔ وہ ولی خاں کی نیشنل عوامی پارٹی کا ایک مذہبی بازو نظر آتے تھے۔ تاہم ان انتخابات میں بھٹو کو ڈیرہ اسماعیل خاں کی واحد نشست پر بھاری اکثریت سے شکست دے کر وہ بین الاقوامی شہرت کے رہنما بن گئے اور انہوں نے ایک سیاست دان کی حیثیت سے اپنی قوت و مقبولیت کا لوہا منوالیا۔

مولانا کا چوتھا دور بھٹو آمریت سے کشمکش اور اس آمریت کے مکمل خاتمہ تک کا دور ہے۔ جس میں وہ عظیم شخصیت بن کر ابھرے اور ملک کے واحد متفقہ رہنما کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچے۔ اس دور میں دو اہم واقعات نے ان کی راہ کے کانٹے صاف کر دیے۔ ایک مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا عبدالحکیم جیسے لوگوں سے نجات اور دوسرے سانحہ راولپنڈی کے بعد متحدہ جمہوری محاذ کے اس ۱۲ نکاتی منشور پر دستخط جس میں اسلام اور جمہوریت کا تو واضح ذکر ہے لیکن کمیونزم اور سوشلزم کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اس منشور پر ولی خاں کی پارٹی نے بھی دستخط کیے اور پہلی بار یہ ترتیب الٹی کہ نیشنل عوامی پارٹی کے سوشلسٹ پروگرام کی حمایت میں مفتی محمود نے تائیدی بیانات کی جگہ مفتی صاحب کے اسلامی اور جمہوری پروگرام پر نیشنل عوامی پارٹی نے

دستخط کیے اور یوں مفتی صاحب ملک کی دوسری اسلامی اور جمہوری قوتوں کے مشترکہ پلیٹ فارم پر خود بھی آ گئے اور اپنے ساتھ دوستوں کو بھی لے آئے۔ اس اہم واقعہ نے نظریاتی محاذ آرائی کا ناخوشگوار سلسلہ ختم کر دیا اور اسلام و جمہوریت کے لیے کام کرنے والی تمام قوتوں کو نہ صرف مجتمع کر دیا بلکہ مفتی صاحب کو اس دینی قیادت کی علامت بنا دیا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

مفتی صاحب کا دامن سوشلزم کی حمایت سے آلودہ رہا تھا جو اب اس سے پاک ہو گیا اور اس تبدیلی نے انہیں اتنا معتبر بنا دیا کہ تحریک پاکستان کی مخالفت کا الزام بھی کسی کو یاد نہ رہا اور پوری قوم ان کی پشت پر جمع ہو گئی، لاکھوں افراد ان کے ادنیٰ اشارے پر جان دینے کے لیے گھروں سے نکل آئے اور ان کی قیادت میں آمریت کی مضبوط کرسی ریزہ ریزہ کر دی گئی۔ بھٹو دور میں مولانا نے اصولوں کی خاطر صوبہ سرحد کی وزارت کو جس طرح لات ماری اور اپنے مختصر دورِ وزارت میں دینی قیادت کی جو روشن مثالیں قائم کیں وہ ہماری سیاسی تاریخ کا ایک قابل فخر باب ہے۔ انہوں نے تحریک نظام مصطفیٰ میں اپنی جرأت و عزیمت، قوت فیصلہ، صبر و تحمل دور اندیشی اور پختہ سیاسی شعور کا ثبوت دینے کے ساتھ ساتھ قید و بند کے دوران اپنے اسلاف کی روایات کی جس طرح پاسداری کی وہ ایک ولولہ انگیز اور قابل صد رشک مثال ہے۔ مفتی صاحب کی ذات میں چونکہ علم، کردار اور دعوتِ دین کے مشن کی وہ مطلوبہ شرائط یکجا ہو گئی تھیں جن کی موجودگی علماء کو انبیاء کا وارث بنا دیتی ہے۔ اس لیے وہ شہرت و مقبولیت کے بام عروج پر پہنچے قیادت کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا اور اس حال میں رکھا گیا کہ یہ بوریہ نشین اور مدرسہ کا مدرس نہ مال و زر رکھتا تھا نہ زمین و جائیداد اس کے پاس ضمیروں کی خریداری کے لیے نہ عہدہ و منصب کی قوت تھی نہ دولت کے انبار، اس کے ہاتھ میں حکمرانی کی لگامیں نہ تھیں لیکن اس کی جنبش انگشت میں یہ قوت و تاثیر موجود تھی کہ لاکھوں افراد اس کے ادنیٰ سے اشارے پر اپنی جان، مال، زمین، جائیداد اور گھر کی ہر شے قربان کر ڈالیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک جس شان سے ہارون الرشید کے دارالحکومت میں داخل ہوئے تھے وہ بھی اسی شان

ے عہد آمریت میں ملک کے گلی کوچوں، شاہراہوں اور خود دار الحکومت میں لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندروں کی لہروں پر اپنی قیادت کا تخت بچھائے گھومتے رہے اور جب فرعون وقت نے اسے زیر کرنا چاہا تو نیل کی موجوں کی طرح سمندر کی یہ لہریں اسے نگل گئیں۔

مولانا مفتی محمود کی سیاسی زندگی کا پانچواں دور صدر ضیاء الحق کا عہد حکومت ہے جس میں وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ اس دور کے واقعات بالکل سامنے کی بات ہے۔ اس لیے ان کی تفصیل چھوڑتا ہوں۔ البتہ اس بنیادی سوال پر پھر آپ کے ذہن کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں کہ مسلمانوں کی قیادت کوئی غیر دینی یا مخالف اسلام شخصیت کیوں نہیں سنبھال سکتی؟ اس کا جواب صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کا قائد صرف ایک ہے اور وہ ہیں ختمی المرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے پاس ان کا دیا ہوا علم وفکر نہ ہو۔ ان کا بخشا ہوا سیرت و کردار کا سرمایہ نہ ہو اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا حوصلہ نہ ہو۔ وہ مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ جبراً قیادت سنبھالے گا تو انہیں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا جسے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنی ہے اسے وارث انبیاء ہونے اور دامن رسالت سے مخلصانہ وفاداری کا رشتہ استوار کرنے کی شرائط پوری کرنا ہوں گی جو اسوہ حسنہ سے قریب تر ہوگا۔ اسی نسبت سے محبوب تر اور مقبول تر ہوگا، جو اس نمونہ کردار سے دور ہٹتا جائے گا۔ اسی نسبت سے ذلت و خواری اس کا مقدر بنتی چلی جائے گی۔

مفتی محمودؒ ہوں یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ان کی شہرت اور قیادت و رہنمائی کا راز بس یہی ہے کہ

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اور اسی سے یہ راز بھی کھل جاتا ہے کہ بیشتر مسلم ممالک میں وہ قائد و رہنما کیوں نہیں ہیں۔

محمد صلاح الدین

ایڈیٹر روزنامہ جسارت کراچی

مولانا مفتی محمود کے انتقال پر
ملک کے اہم اخبارات کے اداریے

روزنامہ نوائے وقت

مولانا مفتی محمود کا انتقال

مولانا مفتی محمود کی وفات سے ملک وقوم ایک ممتاز عالم دین اور ایک بزرگ سیاست دان سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ حج بیت اللہ شریف کے عزم سے چند روز قبل کراچی پہنچے تھے اور اس مبارک سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی مسجد بنوری میں اپنے احباب سے تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا اور طبی امداد کے لیے ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی ان کی روح جسد خاکی سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ○

مولانا مفتی محمود کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک گاؤں عبدالخیل سے تھا لیکن انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ ملتان میں بسر کیا جہاں وہ ایک دینی درس گاہ مدرسہ قاسم العلوم کے مہتمم کے طور پر فرائض ادا کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز قریباً ۴۰ سال پہلے قوم پرست علماء کی تنظیم جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے کیا تھا اور قیام پاکستان کے بعد وہ جمعیۃ علمائے اسلام سے وابستہ ہو گئے۔ بڑے عرصے تک ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے اس تنظیم کی قیادت اور رہنمائی کرتے رہے۔ قومی سیاست میں حصہ لینے کا آغاز ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ وہ ایوب خان مرحوم کے آئین کے تحت پہلے (بالواسطہ) انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن بنے اور پھر انہوں نے بحالی جمہوریت اور نظام اسلام کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان کے حلقے میں پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر بھٹو کے مقابلے میں

بھرپور کامیابی حاصل کی۔ اپنی اسی کارکردگی کا اعادہ انہوں نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ڈیرہ اسماعیل خان کے علاوہ ڈیرہ غازی خان کے حلقے سے بھی کامیابی حاصل کر کے کیا۔ وہ مئی ۱۹۷۲ء کے بعد نو دس ماہ کے لیے صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ بھی رہ چکے تھے لیکن انہیں قومی سطح پر غیر معمولی اہمیت مارچ ۷۷ء کے انتخابات کے لیے قائم ہونے والے (اپوزیشن جماعتوں کے مشترکہ محاذ) پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ منتخب ہونے سے حاصل ہوئی تھی جس نے ملک بھر کے عام لوگوں کی والہانہ تائید سے شخصی آمریت کے خاتمے، بحالی جمہوریت اور نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی تحریک میں جو عہد آفریں کردار ادا کیا، اس میں سربراہی کا شرف مولانا مفتی محمود کو ہی حاصل رہا۔

عبوری آئین (اپریل ۷۲ء) کے نفاذ کے بعد جب صوبوں میں بھی اسمبلیوں کے سامنے جوابدہ وزارتوں کے قیام کی راہ ہموار ہوئی تو مئی ۷۲ء میں مولانا مفتی محمود نے کالعدم نیپ کے اشتراک سے صوبہ سرحد میں مخلوط وزارت بنائی۔ یہ جماعت سیکولر نظامِ سیاست کی علمبردار تھی لیکن مفتی صاحب نے اس سے اشتراک کا جو معاہدہ کیا اس کا سرفہرست نکتہ اسلامی نظام کا قیام ہی تھا لیکن فروری ۷۳ء میں جب بلوچستان اور سرحد میں کالعدم نیپ سے تعلق رکھنے والے گورنروں کو سبکدوش کر کے بلوچستان کی وزارت کو برطرف کیا گیا تو مولانا مفتی محمود نے اسے وفاقی حکومت کی طرف سے ایک خلافِ جمہوریت و آئین اقدام قرار دیتے ہوئے سرحد کی وزارتِ اعلیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور وفاقی حکومت کے پرزور اصرار کے باوجود اپنے اصولی موقف پر قائم رہے۔ اس مختصر عرصۂ اقتدار میں انہوں نے اہل اقتدار کے مروجہ اور روایتی کروفر کے بجائے سادگی اور انکسار سے کام لیا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس سلسلے میں درویشی کی ایک نئی مثال اور روایت قائم کی۔

مولانا مفتی محمود اب خالق حقیقی کی بارگاہِ جلال میں چلے گئے ہیں۔ جہاں ہر شخص (خواہ اس فانی دنیا میں اس کی حیثیت کیا ہو) صرف اپنا ہی نامۂ اعمال لے کر حاضر ہوتا ہے اور علیم و

خبیر اللہ تعالیٰ سے اس کے زادِ راہ میں خیر اور شر کا ذرہ بھی پوشیدہ نہیں رہتا- چنانچہ اس فانی دنیا سے رخصت ہونے والے کے لیے خواہ وہ عامی ہو یا عالم سب مسلمان مغفرت اور بخشش کی ہی دعا کرتے ہیں- ہماری بھی یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی نیکیوں اور دینی خدمت کو قبول فرمائے انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان، احباب، ساتھیوں اور عقیدت مندوں کو صبر جمیل کے ساتھ دین حق کی سربلندی کے لیے ان کوششوں کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے جن کی وجہ سے مولانا مفتی محمود کے انتقال پر ملک میں رنج و غم کے اظہار کے ساتھ ان کے لیے دعائے خیر کی جا رہی ہے-

روزنامہ جنگ

مولانا مفتی محمود

مولانا مفتی محمود بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ خانہ خدا کی زیارت کے قصد سے نکلے تھے لیکن اللہ نے خود اپنے پاس بلا لیا۔ موت ٹھیک اپنے وقت پر آتی ہے۔ اس کی آمد میں نہ ایک لمحے کی تاخیر ہوتی ہے اور نہ تعجیل۔ انسانی اور قومی مصلحتوں کا تقاضا خواہ کچھ ہو "حکم مطلق" کی مصلحت تمام مصلحتوں پر غالب ہوتی ہے خدا کا جب یہ اٹل فیصلہ آ جاتا ہے تو اس کے بندوں کے لیے بہترین راہ اس کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کر دینا اور صبر اختیار کرنا ہے۔

بلاشبہ تقسیم برصغیر سے پہلے کے ان کے سیاسی مسلک اور قیام پاکستان کے بعد ان کے بعض سیاسی وابستگیوں کی بنا پر بعض لوگوں نے ان سے سیاسی اختلاف کیا لیکن ان کے مخالفین بھی اس بارے میں ذرہ برابر شک کا اظہار نہیں کر سکتے کہ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان کے ساتھ اتنی ہی یا اس سے زیادہ محبت کرنے والے تھے جتنی کہ تحریک پاکستان میں حصہ لینے والی کوئی شخصیت پاکستان سے محبت کر سکتی ہے...... مولانا مفتی محمود نے اسلامی دستور کی تحریک کے علاوہ تحریک ختم نبوت اور تحریک جمہوریت میں بھرپور حصہ لیا لیکن ان کے اصلی کارنامے کا تعلق تحریک نظام مصطفیٰ کی قیادت و رہنمائی سے ہے...... اس تحریک کے دوران انتہائی نازک مراحل پیش آئے لیکن مولانا مفتی محمود کے تدبر اور ان کی استقامت نے تحریک کو ایسے تمام

مراحل سے نکال کر کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا۔ اس تحریک کے نتیجے ہی میں ملک سے آمریت کا خاتمہ ہوا اور یہ اس تحریک ہی کا سب سے بڑا حاصل ہے کہ آج صدر جنرل محمد ضیاء الحق کو اسلامی نظام کے قیام کی سعادت حاصل ہو رہی ہے...... یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور کی جس تحریک کا مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا تھانوی، مولانا ابوالحسنات اور دیگر علمائے کرام نے آغاز کیا تھا۔ اسے کامیابی کے بڑے اور آخری مرحلے تک پہنچانے کی سعادت مولانا مفتی محمود کو حاصل ہوئی۔ مولانا کی اس جدائی نے ہمیں ایک نازک دور میں بڑی قیمتی شخصیت اور قابل قدر رہنمائی سے محروم کر دیا۔ خصوصاً سیاست کے میدان میں کوئی شخصیت قابل ہوتی ہے تو اس کی دیانت مشتبہ ہوتی ہے اور کوئی دیانتدار ہوتا ہے تو اس کی قابلیت معرض بحث میں آ جاتی ہے۔ ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں جن کی قابلیت و دیانت دونوں مسلمہ ہوں۔ مولانا مرحوم ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ مرحوم نے اپنی ذات کو زندگی کی آخری سانسوں تک تبلیغ و اشاعت اسلام کے لیے وقف رکھا۔ وہ سادگی، اخلاص اور عزم و استقامت کا پیکر تھے اور ہر محاذ پر لادینیت اور مطلق العنانی کی قوتوں سے برسر پیکار رہے۔ انہوں نے منبر و محراب سے بھی رشد و ہدایت کی دعوت دی اور سیاست کے خرابے میں بھی اسلام اور جمہوریت ہی کا نام لیا...... وہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز رہے۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ ان کے ہر کردار میں اسلام کے ساتھ گہری وابستگی کا نقش غالب رہا اور انہوں نے ملک وقوم کے لیے ایسی دینی اور سیاسی خدمات انجام دیں کہ قوم انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ بالخصوص ۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران انہوں نے استبداد اور مطلق العنانی کی قوتوں کے خلاف جس پامردی اور عزم و حوصلے کے ساتھ جدوجہد کی وہ تاریخ میں ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

روزنامہ جسارت، کراچی

مفتی صاحب، منفرد عہد سیاست

مولانا مفتی محمود ایک علمی مجلس میں زکوۃ وعشر پر اپنے فقہی نقطۂ نظر کا اظہار کر رہے تھے کہ اچانک خالق حقیقی کی جانب سے دعوت اجل آئی - انہوں نے جاری گفتگو موقوف کی اور خاموشی سے اللّٰہم لبیک کہہ کر ایک طرف کو لڑھک گئے - لوگ لپک کر مزاج پرسی کو پہنچے تو وہ اپنے سفر آخرت کی منزل طے کر چکے تھے - تفہیم دین کی اس مصروفیت کے عالم میں سفر آخرت کا یوں طے ہو جانا واقعۃً ایک عالم دین اور مخلص خدمت گزار دین کے شایانِ شان خاتمہ ہے اور ہر مسلمان کے لیے قابل رشک ہے - یہ جہاد ابلاغ دین کی راہ کی مثالی شہادت ہے - مولانا مفتی محمود صاحب کی موت سے پاکستان میں حزب اختلاف کی جمہوری سیاست اور جدوجہد کی تاریخ کا ایک جاندار اور ولولہ انگیز دور تمام ہوا - انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں جمہوری روایات کو استبدادی یلغار میں نابود ہونے سے بچانے کے لیے بڑی جرأت مندانہ جدوجہد کی...... مولانا مفتی محمود نے میدان سیاست میں محض قائد حزب اختلاف ہی کا کردار ادا نہیں کیا - ایک مختصر سی مدت میں انہیں صاحب اقتدار کے کردار کا مظاہرہ کرنے کا بھی موقعہ ملا - وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ رہے اور اپنے عہد وزارت میں انہوں نے قرنِ اول کے مسلمانوں کی سی درویشانہ شان کا مظاہرہ کیا - مولانا مفتی محمود کی شخصیت کے ساتھ علماء پاکستان میں پہلی بار سیاسی تحریکات پر غالب آئے اور ان کی موجودگی نے سیاست کے انداز و اطوار اور نعرے سب

بدل ڈالے اور پھر ان ہی کی قیادت میں برصغیر کی اسی سالہ جدید تاریخ کی سب سے زیادہ پر جوش اور ولولہ انگیز تحریک نظام مصطفیٰ چلی۔

مفتی محمود صاحب کا انتقال بلاشبہ ایک قومی سانحہ ہے اور ان کی موت کی صورت میں اہل وطن نے ایک ہوشمند اور زیرک رہنما اور سیاست دان کو گنوایا ہے- یہ پوری قوم کا نقصان ہے……

روزنامہ وفاق، لاہور

آہ! مولانا مفتی محمود

مولانا مفتی محمود بھی چل بسے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گزشتہ سال انہی دنوں مولانا مودودی کی وفات حسرت آیات نے خادمان اسلام کو غم واندوہ میں مبتلا کیا تھا اور آج اسلامی اقدار کے ایک اور علمبردار اور تحریک نظام اسلام کے قافلہ سالار مفتی صاحب کے سانحہ ارتحال کے باعث پوری قوم نڈھال ہے۔ حق تعالیٰ حضرت مولانا مفتی محمود مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت صحیح معنوں میں اسلاف کا نمونہ تھی۔ قحط الرجال کے اس دور میں شاید ہی کسی جید عالم دین کو سیاسی زندگی میں اتنا سرگرم فعال اور مؤثر کردار ادا کرنے کی توفیق نصیب ہوئی ہو۔ تحریک پاکستان کی علمبرداری کے بعض بڑے بڑے دعویداروں کو بھی تحفظ پاکستان کی خدمت کے سلسلے میں وہ سعی و جہد نصیب نہیں ہوئی جو مرحوم کے حصہ میں آئی۔ مرحوم رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل جانے کے بجائے بدلتی ہوئی اقدار اور بگڑتے ہوئے حالات کے مقابلہ میں ڈٹ جانے والے بزرگ تھے۔ علمی وجاہت دینی قد و قامت اور سیاسی بصیرت کے جوہر ان کی ذات میں اس حد تک نمایاں اور عیاں تھے کہ ہر صاحب نظر پر یہ خوبیاں اور خصوصیات پہلی ہی ملاقات میں آشکارا ہو جاتی تھیں۔

مفتی صاحب مرحوم کی کس کس خوبی اور خصوصیت کا ذکر کیا جائے۔ بخاری شریف کا درس دیتے تو طلباء مسحور ہو جاتے۔ خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تو نمازی وجد میں آ جاتے جلسہ عام

میں تقریر کرتے تو حاضرین متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے- اسمبلی میں خطاب کرتے تو اپنے مخالفین کو مبہوت کر دیتے اور احباب کی مجلس میں ابریشم کی طرح نرم ہونے کی زندہ مثال ثابت ہوتے-

یہ درویش منش عالم دین وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تو بھی ان کی درویشانہ زندگی میں کوئی ایسی تبدیلی محسوس نہیں کی گئی جو بالعموم اقتدار کا خاصہ تصور کی جاتی ہے- وہی قمیض شلوار، وہی جبہ و دستار جو علماء سلف کا طرہ امتیاز رہا ہے- مفتی صاحب کا معمول کا لباس رہا نہ ان کے طرز گفتار میں کوئی فرق آیا نہ اطوار اور کردار میں- پاکستان کی تاریخ میں اور شاید کسی بھی ترقی پذیر ملک کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور غالباً آخری مثال ہوگی کہ ایک صوبائی وزارت انتقامی کارروائی کا نشانہ بنتی ہے تو اس پر احتجاج کرتے ہوئے دوسرے صوبہ کے وزیراعلیٰ (مفتی محمود) مستعفی ہو جاتے ہیں-

قلندرانہ اداؤں اور سکندرانہ جلال کے مظہر حضرت مولانا مفتی محمود نے اسلام اور پاکستان کی جو غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں- ان کے نتیجہ میں قوم کی اجتماعی زندگی کا رخ لادینیت اور اشتراکیت کی طرف سے موڑنے میں اہم مدد ملی ہے- انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج پاکستان میں اسلامی قوانین اور اسلامی حدود کے نفاذ کا ذکر سننے میں آ رہا ہے- اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کا نام تو پہلے بھی لیا جاتا تھا لیکن صرف نام کی حد تک اس نام کو کام سے کوئی غرض نہ تھی- آج اسلام کا نام با مقصد و بامعنی طور پر سننے میں آ رہا ہے- چنانچہ پاکستان کو اس مقدس اور مبارک کام کی وجہ سے غیر معمولی عزت و عظمت بھی نصیب ہو رہی ہے-

حضرت مولانا مفتی محمود کی زندگی کا یہ اہم پہلو بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے دور کے ہر محب وطن اور محبّ دین فرد اور گروہ کے ساتھ غیر مشروط اور غیر محدود تعاون کیا ہے اور ملک وقوم کے ہر بدخواہ کے خلاف محاذ آرائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا- مرحوم مذہبی اور سیاسی انارکسٹوں، فرقہ پرستوں کے خلاف صف آرا اور جادۂ اعتدال و توازن پر گامزن حلقوں کے

شریک و سہیم رہے۔ مرحوم کے اس کردار کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۷۷ء کی نظام اسلام کی تحریک کی قیادت مرحوم کے حصہ میں آئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسلامیان پاکستان کے بھرپور تعاون سے اس تحریک میں کامیابی نصیب ہوئی۔ پاکستان کی تاریخ میں ۱۹۷۷ء کی اس ولولہ انگیز تحریک اور اس میں مفتی صاحب مرحوم کی خدمات جلیلہ کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے بالکل صحیح الفاظ میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ

''مولانا مفتی محمود اپنی سیاسی بصیرت اور دین کے لیے بے لوث خدمات کے سبب بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور مذہبی اور سیاسی میدان میں ان کے کارہائے نمایاں طویل عرصے تک یاد رکھے جائیں گے۔''

حضرت مفتی صاحب مرحوم گزشتہ چند سالوں سے ذیابیطس اور عارضہ قلب کے باعث اکثر بیمار رہتے تھے لیکن شدید علالت کی بنا پر ہسپتال میں بھی زیر علاج ہوتے تو دینی اور سیاسی مسائل حل کرنے میں مصروف و منہمک رہتے۔ حتیٰ کہ بعض اہم مشورے اور فیصلے ان کے ہسپتال کے کمرہ ہی میں کیے جاتے۔ آخری لمحات میں بھی چند گھنٹے اپنے سیاسی احباب کے ساتھ صلاح مشورہ میں گزارنے کے بعد مرحوم مفتی علامہ بنوری مرحوم کی مسجد کے حجرہ میں زکوٰۃ کے بارے میں بعض فقہی مسائل پر گفتگو میں مصروف تھے اور اسی حالت میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ عجیب بات ہے کہ اگلے دن سفر حج کی تیاری تھی لیکن مرحوم کے عقیدت مند انہیں احرام کے نورانی لباس میں دیکھنے کی بجائے کفن پہنانے پر مجبور ہو گئے۔ بے شک ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور بالآخر ہم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ مفتی صاحب کی زندگی بھی قابل رشک تھی اور ان کی موت بھی قابل رشک۔

روزنامہ پاکستان ٹائمز، لاہور

مفتی محمود

مولانا مفتی محمود کے اچانک انتقال نے ملک کے طول وعرض کو سوگوار کر دیا ہے...... ان کے انتقال سے ماضی کے ساتھ ہمارے رشتوں کی کڑیاں مزید کمزور ہوگئی ہیں- مرحوم ایک متنوع شخصیت تھے- جنہوں نے مذہبی میدان کے علاوہ خارزار سیاست میں نمایاں مقام حاصل کیا...... انہوں نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں نمایاں کردار ادا کیا اور ۱۹۷۷ء کی ملک گیر تحریک نظام مصطفیٰ میں اپنی اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا- جمہوریت اور شہری حقوق کے لیے بھی مفتی محمود کی جدوجہد ملک کی سیاسی تاریخ میں منفرد مقام رکھتی ہے- انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر حزب اختلاف کی جرأت مندانہ قیادت کی- صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے انہوں نے اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے کئی اقدامات کیے اور اپنے بلند منصب پر فائز ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی بسر کی جو ایک بہترین مثال ہے-

روزنامہ امروز، لاہور

موت العالِم موت العالَم

مفتی محمود رحلت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون...... ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت میں شرکت سے ان کی سیاسی سرگرمیوں کا احیاء ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ پہلی بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے دوسری بار ۱۹۷۰ء میں اور تیسری بار ۱۹۷۷ء میں انہیں یہی اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں وہ دس ماہ تک صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ ایوب خاں کے دور میں بھی وہ بحالی جمہوریت کے لیے مسلسل جہد آزما رہے اور سابق وزیراعظم بھٹو کے دور حکومت میں بھی۔ انہوں نے نظام مصطفیٰ اور بحالی جمہوریت کی عدیم النظیر تحریک کی رہبری کا فرض جس تدبرو فراست اور بے جگری سے ادا کیا۔ پاکستان کا ایک ایک فرد اس سے آگاہ ہے...... مولانا مفتی محمود شرافت ونجابت کا نمونہ۔ اسلامی اخلاق وتہذیب کے امین اور حلم وبردباری میں فرداتھے۔ معاملہ فہمی کا بے پناہ ملکہ رکھتے تھے۔ اپنے انہی اوصاف خاص طور پر اپنے علمی تجربہ کی بناپر تمام حلقوں میں مقبول تھے۔ ان کی رحلت سے ملک وقوم ایک راست فکر، راست باز اور راست گفتار رہنما سے محروم ہوگیا ہے۔

روزنامہ حریت، کراچی

عالم باعمل

مفتی محمود کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے- وہ ایک بلند پایہ عالم، لائق منتظم اور باوقار سیاست دان تھے- انہوں نے قوم کو انتہائی مشکل وقت میں بے مثال قیادت فراہم کی اور عظیم عوامی تحریک کو کامیابی سے چلایا- مولانا مرحوم علوم قرآن، حدیث اور فقہ کے استاد جلیل تھے- انہوں نے ساری عمر درس و تدریس اور اسلام کی تبلیغ و نفاذ کے لیے عملی جدوجہد کی- ان کے مخالفین بھی اس بات پر متفق نظر آئیں گے کہ مولانا مرحوم ایک عظیم حب وطن اور بے لوث قومی رہنما تھے اور انہیں ملک اور قوم سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی بڑے سے بڑے محبّ وطن کو ہوسکتی ہے...... اس دور میں جب کہ دین کی خدمت اور تبلیغ اسلام کی پشت پر کارفرما جذبات اور لوگوں کی سیاسی وابستگیاں شک و شبہ سے بالاتر نہیں رہی ہیں- ان جیسی صفات کے حامل شخص کی حیثیت گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک روشن چراغ کی تھی اور ان کی جدائی نے ہمیں ایک انتہائی نازک دور میں جب کہ قوم و ملک کو ان کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت تھی- ایک انتہائی اہم مدبر اور قابل قدر رہنما کی قیادت سے محروم کر دیا ہے...... موجودہ نازک صورت حال اور آزمائشوں کے دور میں ان کی کمی ہر لمحہ شدت کے ساتھ محسوس کی جائے گی- ان کی موت انتہائی شدید رنج کے ساتھ ساتھ گہری مایوسی بھی پیدا کر گئی ہے لیکن اگر عوام مولانا کی عقیدت مندی کے تقاضوں سے آگاہ ہیں تو وہ اس مایوسی سے جلد نکل آئیں گے اور جو مشن ان کی قیادت میں چلنے والی بے مثال تحریک کے باوجود پورا نہیں ہوسکا اس کی تکمیل کے لے جلد اٹھ کھڑے ہوں گے- کیونکہ ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو بطریق احسن پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے سوا اور کوئی طریقہ انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا نہیں ہے-

روزنامہ دی مسلم، اسلام آباد

سیاست دانوں کا رہنما چل بسا

مولانا مفتی محمود کی افسوس ناک اوراچانک وفات سے قوم ایک ایسے نامور عالم دین اور قائدِ تحریک جمہوریت سے محروم ہوگئی ہے جس نے زندگی کے آخری سانس تک جمہوریت کی بحالی کی جنگ لڑی۔ مفتی محمود مسلم قومیت کے سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنی کے نظریات کے پیروکار تھے لیکن مفتی محمود کی راست فکری اور اعلیٰ ظرفی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تخلیق پاکستان کے بعد انہوں نے اس نئی مملکت کے استحکام اور فلاح و بہبود کے لیے خود کو وقف کر دیا...... انہوں نے سادہ زندگی گزاری۔ اپنے عزیز ترین مقاصد کے حصول کے لیے ان کے پاس قربان کرنے کے لیے مادی طور پر کچھ نہ تھا لیکن پھر بھی وہ ان مقاصد کے لیے ہمہ تن قربانی دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مفتی محمود کے اس بے مثال جذبے اور قربانی نے ان کے گرد ایسے محب وطن کارکنوں کو اکٹھا کر دیا جو ان ہی کی طرح اپنے سیاسی اور مذہبی مقاصد کے حصول کے لیے قربانی کے جذبہ سے سرشار رہتے اور مختلف تحریکوں میں ایسے ہی کارکنوں نے جیلیں بھر ڈالیں۔ اسی بنا پر شاید مفتی محمود نے ایک بار کہا تھا ”ہم قومی سیاست کا ایسا ناگزیر حصہ ہیں کہ ہمارے بغیر اس ملک کی سیاست نہیں چل سکتی“

مفتی محمود نے گزشتہ اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے قومی سیاست پر یادگار نقوش چھوڑے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں بلوچستان

وزارت کی جبری سبکدوشی پر انہوں نے اقتدار کے اس اعلیٰ منصب کو بطور احتجاج چھوڑنے میں کوئی پس و پیش نہ کی۔ جس کے حصول کے لیے لوگ خوابوں میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ سیاست میں اختلاف بھی ہوتے ہیں اور افراد سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں لیکن مفتی محمود سیاست میں ایک بلند قامت شخصیت تھے سامراجی نظام کے خلاف ان کے نظریات، مذہبی اور سیکولر نظریات رکھنے والے سیاسی افراد کو ایک پلیٹ فارم پر ساتھ لے کر چلنے کا ان کا مخصوص سلیقہ شہریوں کے حقوق اور جمہوریت کے لیے ان کی تھکا دینے والی جدوجہد، خلاصۃً سادہ اور پاکیزہ زندگی گزارنے کا ان کا انداز، مذہبی، سیاسی اور پارلیمانی زندگی میں خود فراموشی کی کیفیت مدتِ دراز تک عوام کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھے گی۔

ہفت روزہ ایشیا' لاہور

چراغِ آخر شب

مفتی صاحب کی اچانک رحلت نے شائستہ، شریفانہ اور پابند اخلاق سیاست کو ویرانہ بنا دیا...... اب وضعدار سیاست کی زبان جاننے والا بھی کوئی نہ رہا۔ مفتی صاحب چراغ آخر شب تھے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد تو اب بالکل ہو کا عالم ہے...... ان کی زندگی سے پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ سیاست دان کو درویش ہونا چاہیے۔ اس کے لیے لائق کشش عہدہ و منصب نہیں بلکہ صرف اصول ہیں اور مفتی صاحب اس بلند اصول سیاست کے اسوہ حسنہ تھے۔ وہ سرحد کے وزیراعلیٰ بنے لیکن یہ عہدہ بھی ان کے درویشانہ انداز زندگی پر اثر انداز نہ ہو سکا...... مفتی صاحب نے بلوچستان کی نیپ حکومت کی بلاوجہ برطرفی پر احتجاج کرتے ہوئے وزارت اعلیٰ سرحد سے استعفیٰ دیا تو بھٹو نے ان سے استدعا کی کہ وہ سرحد کی وزارت اعلیٰ پر بدستور قائم رہیں لیکن مفتی صاحب نے بھٹو مرحوم کی پیشکش کو ٹھکرا دیا کیونکہ ان کے نزدیک اصل چیز اصول تھا۔ جاہ و منصب نہ تھا...... مفتی صاحب کی زندگی کا دوسرا سبق آموز پہلو ان کی رواداری اور اتحاد کی اسپرٹ تھا۔ بعض دینی جماعتوں سے مفتی صاحب کو دینی اختلافات رہے لیکن مشترکہ سیاسی جدوجہد میں انہوں نے اختلافات کو کبھی حائل نہ رہنے دیا...... ۷۲ء میں دستور سازی کے سلسلے میں برسر اقتدار پیپلز پارٹی کے عزائم بتدریج نمایاں ہونے لگے تو پارلیمنٹ میں موجود اسلامی اور جمہوری نظام کی حامی جماعتوں کے کان کھڑے ہوئے۔ پیپلز پارٹی اپنی اکثریت

کے بل بوتے پر ایک سیکولر اور سوشلسٹ دستور لانا چاہتی تھی- اگر مفتی صاحب اور دوسرے باشعور رہنما اس خطرے کو بھانپ کر مقابلے کے لیے تیار نہ ہوتے تو نہیں کہا جا سکتا کہ ملک کی تاریخ کیا رخ اختیار کرتی ...... مفتی صاحب کی زندگی کا تیسرا عظیم پہلو وہ تجربہ ہے جو انہوں نے قومی اتحاد کے سربراہ کی حیثیت سے حکومت میں شامل ہو کر کیا تھا...... حکومت میں شمولیت کے تجربے نے مفتی صاحب پر جلد ہی واضح کر دیا کہ نامزد حکومت میں وہ اخلاقی قوت نہیں ہوتی جو منتخب حکومت میں ہوتی ہے- اگر جمہوریت کو اپنی بحالی کے لیے انتخابی اعتماد اور تعاون کی ضرورت ہے تو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جس سے ناآشنائی پر امت مسلمہ کو صدیاں بیت گئی ہیں- اس سے کہیں زیادہ اعتماد اور عوامی تعاون کی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ عمر کے آخری ایام میں وہ شدت سے چاہتے تھے کہ وہ ۵ جولائی کی تبدیلی جس مقصد کے لیے آئی تھی وہ جلد پورا ہو۔

سفر آخرت کی جھلکیاں

اور آخر میں حضرت مولانا مفتی محمود کے سفر آخرت کا احوال۔ مولانا مرحوم کے ایک عقیدت مند عاشق اشفاق ہاشمی کی زبانی۔ جناب ہاشمی نے حضرت مولانا مرحوم کی زندگی میں صوبہ سرحد میں ان کے دور حکومت کے حوالے سے ایک اچھی کتاب بھی تحریر کی تھی۔ یہ جمعیت علماء اسلام کے بڑے سرگرم کارکن ہیں اور مولانا مرحوم سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے ہیں۔

☆ پاک فضائیہ نے مولانا مفتی محمود کی میت کو ڈیرہ اسماعیل خاں لے جانے کے لیے خصوصی انتظامات کیے تھے اور ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ایک طیارہ ریزرو میں رکھا تھا تاکہ مولانا کے جسد مبارک کو لے جانے والے طیارہ میں اچانک کوئی فنی خرابی پیدا ہو جانے کی صورت میں دوسرے طیارے کو بروقت استعمال کیا جا سکے۔ مفتی صاحب کی میت کے ساتھ جانے والوں کو اسی طیارہ کے ذریعے کراچی پہنچانے کا بھی انتظام تھا۔

☆ ۱۵۔ اکتوبر کو صبح ۶ بج کر ۵ منٹ پر پاک فضائیہ کے خصوصی طیارہ سی ۱۳۰ کے ذریعے مولانا مفتی محمود کے جسد خاکی کو کراچی سے ملتان روانہ کیا گیا۔

☆ طیارے میں میت کے ساتھ دوسرے تیس افراد کے علاوہ نوابزادہ

نصر اللہ خاں مفتی محمود کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن اور پاک فضائیہ کے ونگ کمانڈر فدا محمد بھی روانہ ہو گئے۔

☆ مولانا مفتی محمود کی میت صبح ۵ بجے جب بنوری ٹاؤن کے مدرسہ سے ہوائی اڈہ کے لیے روانہ کی گئی تو ان کے ہزاروں عقیدت مندوں کی ہچکیاں بندھ گئی۔ مولانا کی میت سندھ ہلال احمر کی ایک جیپ میں رکھی گئی تھی۔

☆ ۶ بج کر ۱۵ منٹ پر جب طیارہ مولانا مفتی محمود کی میت کو لے کر فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ خان عبدالولی خاں تاخیر سے رن وے پر پہنچے۔

☆ مولانا مفتی محمود کی میت ۱۲ بج کر ۱۵ منٹ پر ڈیرہ اسماعیل خاں کے ہوائی اڈے پر پہنچی صبح ۸ بجے سے ہی ائرپورٹ اور جنازہ گاہ پولو گراؤنڈ میں ہزاروں افراد جمع ہو چکے تھے۔

☆ پنجاب اور سرحد کے درمیان دریائے سندھ پر کشتیوں کے پل کو جو ابھی نامکمل تھا۔ ڈیرہ اسماعیل کی انتظامیہ نے ہنگامی طور پر مکمل کر کے فوری ٹریفک کے لیے کھول دیا جس سے پنجاب سے جانے والے ہزاروں عقیدت مندوں کو سہولت میسر ہوئی۔

☆ نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے حکومت سرحد نے وسیع تر انتظامات کر رکھے تھے۔ فرنٹیر فورس ملیشیا فورس اور پولیس کے جوان بھاری تعداد میں ائرپورٹ اور پولو گراؤنڈ اور سڑکوں پر تعینات تھے انسپکٹر جنرل پولیس سرحد خود انتظامات کی نگرانی کر رہے تھے۔

☆ جو لوگ صبح سے ایئرپورٹ پر پہنچے ہوئے تھے۔ وہ مفتی صاحب کی میت طیارے کی آمد تک ائرپورٹ لاؤنج میں قرآن خوانی کرتے رہے۔

☆ ۱۲ بج کر ۲۶ منٹ پر فضائیہ کا خصوصی طیارہ مفتی صاحب کی میت کا تابوت لیے ڈیرہ اسماعیل خان کی فضا میں نمودار ہوا تو لاکھوں عقیدت مندوں کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ ایک بج کر ۵۵ منٹ پر طیارہ رن وے پر اترا تو سابق گورنر سرحد ارباب سکندر خان خلیل سابق صوبائی وزیر محمد افضل خاں سابق وفاقی وزیر حاجی فقیر محمد خاں۔ حرکت انقلاب اسلامی افغانستان کے قائم مقام امیر مولانا محمد شاہ ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین اور دیگر بہت سے رہنما طیارے کی طرف بڑھے۔

☆ طیارے کا دروازہ کھلتے ہی سابق سینٹر اور کالعدم این ڈی پی کے صدر حاجی غلام احمد بلور اور ارباب سکندر خان خلیل نے آگے بڑھ کر تابوت کو اُتارا۔

☆ مفتی صاحب کی میت کا تابوت طیارے سے باہر آیا تو ایئر پورٹ پر موجود ہزاروں عقیدت مند دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

☆ پولیس کی مدد سے مفتی صاحب کی میت کا تابوت ایئر پورٹ سے ایک وین میں رکھ کر ہزاروں موٹروں، سکوٹروں اور کاروں کے جلوس کی شکل میں نماز جنازہ کی ادائیگی کے لیے پولو گراؤنڈ میں لایا گیا۔ وین میں مفتی صاحب کے صاحبزادے کے علاوہ ان کے دیرینہ رفیق اور سابق صوبائی وزیر محمد افضل خاں موجود تھے۔

☆ خصوصی طیارے میں مفتی محمود کے جسد خاکی کے ساتھ چند بڑے رہنما اور جید علماء بھی ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچے۔ جس میں کالعدم جمعیۃ کے سربراہ حضرت مولانا عبداللہ درخواستی نوابزادہ نصراللہ خاں مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن سابق وفاقی وزیر میر صبح

صادق کھوسو اور مولانا محمد بنوری بھی شامل تھے۔

☆ چار بج کر ۵ منٹ پر ایک ہیلی کاپٹر عبدالخیل میں اترا جس سے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق چیف آرمی سٹاف جنرل سوار خاں گورنر سرحد جنرل فضل حق سابق وزراء خواجہ محمد صفدر اور چوہدری ظہور الٰہی مفتی صاحب کی تدفین کی شراکت کے لیے پہنچے۔

☆ نماز جنازہ ادا کرنے سے پہلے عوام کے اصرار پر نواب زادہ نصراللہ خاں اور مفتی محمود کے صاحب زادے مولانا فضل الرحمٰن نے مفتی صاحب کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کی تقاریر پر تمام مجمع میں آہ و بکا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

☆ ساڑھے چار بجے مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں ایک لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔

☆ نماز جنازہ کے بعد صدر جنرل ضیاء الحق نے مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن سے تعزیت کی۔

جنازہ اٹھایا گیا تو صدر جنرل ضیاء الحق نے سب سے پہلے میت کو کندھا دیا اور ساتھ چلتے رہے۔

پانچ بجے اس بطل جلیل کی میت کو لحد میں اتارا گیا۔ اس موقعہ پر سینکڑوں علماء اور قومی شخصیات کے علاوہ ہزاروں شہری موجود تھے کہ اس طرح اس عظیم شخص نے زندگی کا سفر مکمل کیا۔

حضورؐ مجھے بلا رہے ہیں

(مولانا فضل الرحمٰن کے تاثرات)

وطن عزیز میں مولانا مرحوم نے جہاں علم دین کا کام جاری رکھا وہاں سیاست کے میدان میں اور اسلامی نظام کے احیاء کے لیے زبردست جدوجہد کی۔ مختلف تحاریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی علمی قابلیت، سیاسی بصیرت کا غیروں سے بھی لوہا منوایا۔

مولانا مرحوم کی شخصیت کے علمی دینی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرنا مجھ ایسے کم علم شخص کا کام نہیں۔

مولانا مفتی محمود کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ انہوں نے گھر سے زیادہ قوم کو وقت دیا۔ آپ نے اسلامی نظام کے احیاء اور شریعت محمدیؐ کے نفاذ کے لیے بے مثل اور کٹھن جدوجہد کی کلمہ حق کے لیے سینہ سپر رہے۔ آپ باطل سے نہ کبھی دبے اور نہ ہی دنیا کی کوئی طاقت انہیں خرید سکی۔

مولانا کا خواب

ہم نے انہیں ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو کراچی کے لیے رخصت کیا جہاں سے وہ عازم جدہ ہونے والے تھے۔ اس سے قبل ملتان میں ہمیں بتایا کہ انہیں خواب میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضورؐ قبر مبارک میں لیٹے ہوئے ہیں ہمارے درمیان کوئی چیز حائل نہیں اور حضور مجھے بلا رہے ہیں۔ اس سے قبل مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے مسنونہ عمر طبعی (۶۳

برس) پوری کر چکا ہوں۔ اب تو محض اضافی عمر گزار رہا ہوں۔

سفر آخرت

مولانا فضل الرحمٰن نے مفتی صاحب کے سفر آخرت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وفات کے روز صبح انہوں نے خوشبو، لگائی اور لاٹھی جس کے سہارے وہ چلتے تھے اس روز رکھ دی کہ اس کی ضرورت نہیں بعد ازاں آپ علماء کی ایک مجلس میں زکوٰۃ کے مسئلے پر تقریر کر رہے تھے کہ دس منٹ بعد انہوں نے ماتھے کو پکڑا اللہ کا نام لیا اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

دین کا نام گھر پر چھوڑا

والد مرحوم ایک شفیق باپ تھے۔ انہوں نے دین کا نام گھر پر چھوڑا اور تمام عمر دولت جمع نہیں کی۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں دولت جمع کر بھی لوں تو دنیا کا مالک اسے چھین لے تو پھر میں کیا کروں گا ایسی چیز جمع کر کے۔ دین کی تعلیم ہی میرے بچوں کا سرمایہء حیات ہے۔

ان کی خواہش تھی کہ میرے بچے عالم دین بن کر اسلام کی خدمت کریں۔